سُنّتِ خیر الانام

علیہ الصلوٰۃ والسلام

فتنۂ انکارِ سُنّت پر تحلیلی و تنقیدی نظر منکرینِ سُنّت حضرات کی غلط فہمیوں کا ازالہ، شُبہات کا رد اور اعتراضات کا جواب۔ قرآن و سنّت کا باہمی ربط۔ اتباعِ سُنّت کے عقلی و نقلی دلائل۔ تدوینِ احادیث کی تاریخ اور محدّثینِ کرام کے احوال۔

تالیف

پیر محمد کرم شاہ صاحب

فاضلِ جامعہ ازھر

سجادہ نشین

بھیرہ، ضلع سرگودھا

ناشر:- مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ کراچی ۱

تعداد طباعت ——— ایک ہزار

سنِ طباعت ——— ستمبر ۷۱ء

کتابت ——— عبدالرؤف

طابع ——— نفیس اکیڈیمی آفسٹ پرنٹرز۔ کراچی

ناشر ——— مدینہ پبلشنگ کمپنی

قیمت ——— ۱۸ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ۔ کراچی

فہرست

فہرست مراجع کتاب ھذا

قرآن حکیم

تفسیر:

① الجامع لاحکام القرآن، للامام ابی عبد اللہ القرطبیؒ
② جامع البیان، للامام ابن جریر الطبری
③ احکام القرآن، للامام ابی بکر الجصاص
④ الکشاف، للعلامۃ الزمخشری
⑤ المنار، للشیخ محمد رشید رضا

حدیث

① الصحیح، للامام البخاریؒ
② الصحیح، للامام مسلمؒ
③ المسند، للامام الدارمیؒ
④ عمدۃ القاری، للعلامۃ بدر الدین العینیؒ
⑤ فتح الباری، للامام ابن حجرؒ
⑥ مقدمۃ اشعۃ اللمعات، للشیخ المحقق عبد الحقؒ الدہلوی
⑦ فتح الملہم شرح الصحیح مسلم، للشیخ شبیر احمد عثمانیؒ
⑧ الاربعین للنوویؒ

رجال حدیث

① الاصابہ فی معرفۃ الصحابۃ، للامام ابن حجرؒ
② تذکرۃ الحفاظ للامام الذہبیؒ
③ وفیات الاعیان للامام ابن خلکانؒ
④ تہذیب الاسماء للامام النوویؒ
⑤ حلیۃ الاولیاء المحدث الکثیر ابی نعیمؒ

فقہ واصول فقہ

① الرسالۃ للامام الشافعیؒ
② الاحکام فی اصول الاحکام للعلامۃ الآمدیؒ
③ الموافقات للامام الشاطبیؒ
④ التحریر للامام ابن ہمامؒ
⑤ المستصفی للامام الغزالیؒ
⑥ ارشاد الفحول العلام الشوکانیؒ
⑦ کتاب التحقیق
⑧ اصول الفقہ للشیخ الخضریؒ
⑨ الفتاوی الخیریۃ للرملیؒ
⑩ اعلام الموقعین للعلامۃ ابن قیمؒ
⑪ کتاب الخراج للامام ابی یوسفؒ
⑫ کتاب الاحکام للامام ابن حزمؒ
⑬ تاریخ الفقہ الاسلامی الشیخ محمد علی السایس
⑭ المیزان للامام الشعرانیؒ

سیرت و تاریخ

① التاریخ الکامل لابن الاثیرؒ
② البدایۃ والنہایۃ للامام ابن کثیرؒ
③ زاد المعاد للعلامۃ ابن قیمؒ
④ تاریخ بغداد الخطیب البغدادیؒ

لغت

① مفردات القرآن راغب اصفہانیؒ ② لسان العرب ابن منظورؒ
③ تاج العروس للزبیدی



پیش لفظ

از کلکِ گوہر بار مجاہدِ ملت حضرت العلامہ
مولانا محمدؒ قمر الدین صاحب سجادہ نشین آستانۂ عالیہ سیال شریف

اسلام کو روزِ اول سے جن فتنوں اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا، اگر کسی دوسرے مذہب کو ان سے واسطہ پڑتا تو وہ اُسے پیس کر رکھ دیتے۔ اس کا شیرازہ بری طرح سے پراگندہ ہوجاتا، اور اس کی خاک تک کو بھی مخالف ہوائیں اڑا چکی ہوتیں۔ اگر ایک شعلہ بجھتا ہے تو دوسرا بھڑک اٹھتا ہے، اگر ایک بغاوت فرو ہوتی ہے تو نئی بغاوتیں رُونما ہوجاتی ہیں، اگر ایک سازش کا خاتمہ ہوتا ہے تو تخریبی عناصر کسی اور خوفناک سازش کا دام ہمرنگ زمین بچھانے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

لیکن اسلام ان تُند و تیز طوفانوں میں روشنی کے بلند مینار کی طرح قائم رہا۔ اس کی دلفریب تجلیات تاریکیوں کا سینہ چیرتی رہیں اور گرداب و تلاطم میں پھنسے ہوئے سفینوں کو سلامتی کے ساحل تک پہنچاتی رہیں اور اسلام کا یہ مینار تا قیامت یونہی ضیا پاش رہے گا۔

مجھے قارئینِ کرام کی خدمت میں ایک ایسی کتاب پیش کرتے ہوئے قلبی مسرت

ہو رہی ہے جو اپنے اندازِ بیان میں دلفریب، اسلوبِ نگارش میں انوکھی اور شکوک و شبہات کے رد میں نہایت بیباک ہے اور جس کا دامن قوی دلائل سے بھرپور ہے۔ جس میں ایک ہولناک سازش کو بے نقاب کیا گیا ہے جس کے تار و پود کو انتہائی مہارت اور عجیب سبکدستی سے بنا جا رہا ہے اور جس پر کمال مہارت سے ایک نظر فریب اور دلکش ملمع کیا جا رہا ہے۔ اس سے میرا مُدعا وہ ناپاک سازش ہے جو سید المرسلین رحمۃ للعلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّتِ طاہرہ کے خلاف کی جا رہی ہے۔

اس نظریۂ باطل (انکارِ سنّت) کے پیار کرنے والوں کے پاس کوئی مضبوط اور نہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی گم کردہ راہ فرقوں نے ان کا سہارا لیا اور حق و صداقت کے علمبرداروں نے ان کے طلسمِ باطل کو توڑا اور ان کے دلائل کے ضعف، تضاد اور تعصّب کو واشگاف کر کے رکھ دیا۔ وقت اس حقیقت کو آشکار کر دے گا کہ حق کا پلّہ اب بھی بھاری ہے۔ اس کے پاس ایسے ذی استعداد آدمیوں کی کمی نہیں جو اس کی عزّت کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اس کی ناموس پر دست درازی کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے ہیں اور منکرینِ سنّت کے اس گروہ کو مکر و فریب کی بے پناہ قوتوں کے باوجود عنقریب ہی پتہ چل جائے گا کہ اس کا انجام عبرتناک ناکامی کے سوا کچھ نہیں۔ انھوں نے آج تک ساحرانہ مکاری سے کام لیا ہے اور ساحر جتنی کروفر سے آئے اس کے مقدر میں ذلّت و رسوائی رقم ہو چکی ہے۔

منکرینِ سنّت کہتے ہیں کہ ہم صرف قرآن کریم کی اتباع کریں گے اور ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ ان پر مدت دراز بیت چکی ہے، ماحول بدل گیا، معاشرہ کی ضروریات میں جوہری تبدیلیاں وقوع پذیر ہو گئیں اور اب وہ اقوال و افعال اس قابل نہیں رہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔ مجھے اپنی حیاتِ مستعار کی قسم، کتنی لغو ہے یہ بات! وہ سنّتِ نبوی کو ترک کر کے قرآن پر

کیسے عمل کر سکتے ہیں، حالانکہ تا قیامت اتباعِ سنّتِ نبوی کا حکم قرآنِ حکیم کی بے شمار واضح ترین آیات میں ہے جن کی کوئی تاویل بھی نہیں ہو سکتی اور رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی سے نہایت سختی سے منع کیا گیا ہے اور نافرمانی کی جسارت کرنے والوں کو دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ کیا وہ قرآنِ کریم کی اس آیت کے مصداق تو نہیں

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ)

ترجمہ: کیا تم کتاب کے کچھ حصّہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرے اس کی سزا اس کے بغیر کیا ہے کہ اسے دنیا میں ہی رسوا کیا جائے اور قیامت کے روز تو انھیں سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور جو کارستانیاں تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اُن سے بے خبر نہیں۔ (اعلحضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ)

اسی قسم کی بات جب اپنے عہد کے نادرِ روزگار فاضل، مطرف بن عبداللہ سے کہی گئی کہ ہمیں قرآن کے بغیر اور کچھ مت سناؤ تو آپ نے فرمایا، بخدا ہم کسی چیز کے لئے ہرگز قرآن چھوڑنا نہیں چاہتے لیکن ہم قرآن سمجھنے میں ایک ہستی کا سہارا لینے پر مجبور ہیں جو قرآن کے اسرار و رموز کو ہم سے کہیں زیادہ سمجھتی ہے[1] (یعنی ذات قدسی صفات رسالت مآب علیہ الصّلوٰۃ والسّلام)۔ سبحان اللہ! کتنا عمدہ اور دنداں شکن ہے یہ جواب!

[1] الموافقات للامام الشاطبی ج ۴ ص ۲۶۔

حقیقت یہ ہے کہ اتباعِ سنت ترکِ قرآن نہیں بلکہ قرآن کے احکام وارشادات کی ایسی تعمیل کا نام اتباعِ سنت ہے جو منشارِ ربانی کے عین مطابق ہے۔

منکرینِ سُنت علماءِ اُمّت پر یہ بہتان بھی لگاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام میں پاپائیت اور برہمنیت کا بدنام روزگار نظام قائم کر دیا اور اس طرح شریعتِ اسلامیہ پر ایک ناقابل برداشت ظلم کیا۔ آخران کا اس الزام سے مقصد کیا ہے؟ کیا یہ کہ علماء نے جاہلوں اور بندگانِ ہوا و ہوس کے لئے دینی امور میں فتویٰ بازی کا دروازہ بند کر دیا، تو یہ بجا ہے۔ اور اس پر وہ نازاں ہیں اور اپنی اس فرض شناسی کے عوض وہ اللہ جل مجدہٗ سے بہترین اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ اور اس کو پاپائیت و برہمنیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں، اور اگر اس الزام سے ان کا مقصد کچھ اور ہے تو ازراہِ کرم گستری ذرا وضاحت فرمادیں۔

شاید انہیں پاپائیت و برہمنیت کے ظالمانہ نظام اور ان کی زہرہ گداز کارکردگیوں کا علم ہی نہیں یا علم تو ہے لیکن کسی مصلحت پنہاں کے پیشِ نظر وہ اُسے چھپا رہے ہیں۔ میں بتوفیقہٖ تعالیٰ ان کے بھیانک چہرہ سے نقاب الٹتا ہوں تاکہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

برہمنیت

جب ہندوستان میں سوسائٹی کو چار طبقات میں تقسیم کیا گیا تو برہمنوں کو سب سے اعلیٰ مقام دیا گیا اور بہت سے خصوصی مراعات سے انہیں نوازا گیا۔ اس طرح انہیں تمام اہل ملک سے برتر مخلوق تصوّر کیا جانے لگا۔ منوشاستر کا مؤلف رقم طراز ہے:-

"قادرِ مطلق نے مصلحتِ عامہ کے لئے برہمنوں کو اپنے منہ سے، کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے، ویشوں کو اپنی رانوں سے اور شودروں کو اپنے پاؤں سے پیدا کیا۔"

منو دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"برہمن خدا کی پسندیدہ ترین مخلوق ہیں وہ سب کے بادشاہ اور دنیا کی ہر چیز کے مالک و مختار ہیں اور وہ برہمن جو رگ وید کا حافظ ہو وہ بخشا ہوا ہے اگرچہ وہ اپنی زشتی کردار اور گناہوں سے تینوں جہانوں کو برباد کر دے۔ بادشاہ کو انتہائی ضرورت و احتیاج کے وقت بھی برہمنوں سے کوئی ٹیکس وصول کرنے کا اختیار نہیں۔ اگر کوئی برہمن سزاءِ قتل کا مستحق ہو تو حاکم اس کو قتل کرنے کا مجاز نہیں۔ وہ صرف اس کا سر مونڈ سکتا ہے، حالانکہ غیر برہمن پر سزائے قتل نافذ کی جائے گی۔ اگر کوئی اچھوت کسی برہمن کو مارنے کے لئے ہاتھ یا سوٹی بڑھائے گا، اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اور اگر اس نے غصہ سے ٹھوکر ماری تو اس کا پاؤں کاٹ دیا جائے گا اور اگر اس نے گالی نکالی تو زبان کاٹ دی جائے گی اور اگر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ کسی برہمن کو پڑھاتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اُس کے مُنہ میں انڈیل دیا جائے گا۔"[1]

یہ ہیں وہ ظالمانہ اختیارات و امتیازات جو ہندی معاشرہ میں برہمنوں کو حاصل تھے۔ میں آپ کو خدائے ذوالجلال کے نام کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا کسی عالِم نے ان امتیازات میں سے کسی ایک کا بھی دعویٰ کیا۔ کیا آپ نے کسی کی زبان سے یہ سُنا کہ اُس کا جسم دوسرے انسانی اجسام سے اعلیٰ اور پاکیزہ تر ہے اور اگر اس سے کوئی جُرم سرزد ہو تو اسے سزا نہیں دی جائے گی؟ یا اگر اس نے بے گناہ قتل کیا تو قصاص سے وہ مستثنیٰ ہے؟ یا اگر اس سے ایسا جُرم صادر ہو جس کے ارتکاب پر شریعت نے کوئی حد مقرر کی ہے تو وہ حد اُس پر جاری نہیں کی جائے گی؟

[1] ماذا خسر العالم لابی الحسن الندوی ۲ - ۴۱

اسلام کا کوئی بدترین دشمن بھی ان کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا تو پھر ان قلموں کو کیا کہئے جو ان نفوسِ قدسیہ پر اندھا دھند الزام لگانے میں مصروف ہیں جنہوں نے عمر بھر دل وجان سے اس دینِ حنیف کی پاسبانی کی۔ کتنی ہی اچنبے کی چیز ہے ان کی یہ بے سروپا الزام تراشی !

پاپائیت

یورپ میں کئی صدیوں تک پاپائیت کو انتہائی جلال وتمکنت حاصل رہی۔ تاج وتخت خداوندانِ کلیسا کے دستِ تصرّف میں تھے۔ فقط وہی خوش نصیب ان کا مستحق سمجھا جاتا جسے پوپ اعظم کی خوشنودی کا پروانہ میسّر ہوتا اور جس کی طرف پوپ کی عتاب آلود نگاہیں اٹھ جاتیں اُسے خلعتِ شاہی اتارے بغیر بن نہ آتی۔ پاپائیت کے عہدِ اقتدار کی تاریخ طویل ہے، اس کے بیان کی یہاں گنجائش کہاں؟ میں صرف قانونی نقطۂ نظر سے اس کے متعلق کچھ کہوں گا۔

پروفیسر کینی نے اپنی کتاب Kenays out lines of criminal law کے صفحہ ۷۵ پر اور یورپ کے دیگر ماہرین نے اپنی گراں مایہ تصانیف میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

قسیسوں اور کلیساؤں کے خدام کو بے حد وقید خصوصی امتیازات وحقوق حاصل تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ عام عدالتوں کو ان کے محاسبہ کا اختیار نہ تھا، خواہ ان کے جُرم کی نوعیت کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوتی۔ بلکہ ان کے لئے خاص عدالتیں تھیں جن کا صدر ایک پادری ہوا کرتا۔ مجرم پادری کو بری ثابت کرنے کے لئے خاص وسائل سے کام لیا جاتا اور اگر اس کو بری کرنا کسی صورت میں ممکن نہ ہوتا تو انہیں صرف یہ سزا دی جاتی کہ انہیں اپنے منصب سے گرا دیا جاتا

یا زیادہ سے زیادہ اسے کچھ عرصہ کے لئے قید کر دیا جاتا اور کوئی حاکم خواہ اس کا قانونی عہدہ کتنا ہی اعلیٰ ہو اس بات کا مجاز نہ تھا کہ بے گناہ آدمی کے دانستہ قتل کے مرتکب پادری کو وہ پھانسی کی سزا دے۔

لیکن اسلام انسان اور انسان میں کسی ایسے امتیاز وتفریق کا قائل نہیں۔ حاکمِ مطلق وہ خالقِ کائنات ہے اور اسلامی عدالتوں کا یہ فرضِ اولین ہے کہ اس کے تمام احکام کو ان کی تمام شقوں اور تفصیلات کے ساتھ نافذ کریں۔ ہر شخص خواہ وہ سلطانِ وقت ہو یا معاشرہ کا عام فرد، وہ مجبور ہے کہ وہ ان عدالتوں کے سامنے پیش ہو۔

اے معترضینِ کرام! آپ کے پاس تاریخ کے لاتعداد دفاتر اور قانونِ اسلامی کی ان گنت کتابیں ہیں۔ ان کی ورق گردانی کیجئے۔ صفحہ صفحہ اور سطر سطر کھنگال دیجئے اور رب قدوس کو شاہد بنا کر بتائیے کہ کیا آپ کو ایک ایسا قانون دستیاب ہوا ہے جس نے علماء کو مستثنیٰ کیا ہو یا کسی ایسے قول کی سراغ رسانی میں آپ کامیاب ہوئے ہیں جس میں کسی عالم نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ احکام الٰہیہ سے فلاں حکم اس پر نافذ نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ اپنے اعوان وانصار سمیت مدت العمر کوشاں رہیں تو آپ ایسی کوئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ اگر آپ آج تک ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکے اور آیندہ بھی ہرگز پیش نہیں کر سکیں گے تو خدا کا خوف کیجئے اور اس ہرزہ سرائی کو بند فرمائیے۔

اس مختصر سے پیش لفظ کے ساتھ میں آپ کی خدمت میں ایک جلیل القدر کتاب پیش کرتا ہوں جس کی تالیف کا شرف عزیزم ابو الحسنات محمد کرم شاہ الازہری (بھیرہ، ضلع سرگودھا، پنجاب) کو حاصل ہے۔ اس کی یہ مجاہدانہ کوشش

مستحق تبریک وتحسین ہے۔ اس میں اس نے اس مہلک مرض کے کامیاب علاج کی نہایت کامیاب اور مخلصانہ کوشش کی ہے۔ رشک کرنے والوں کو ایسے کام میں رشک کرنا چاہئے۔

آخر میں میں بارگاہِ الٰہی میں اس کی رحمت وکرم کا دامن تھام کر التجا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کو اپنے حضور میں شرفِ قبولیت عطا فرمادے اور اس کے مؤلف کو شرحِ صدر کی نعمت سے نوازے تاکہ ایسے پیچیدہ مسائل میں جہاں عقلِ انسانی اُلجھ کر رہ جاتی ہے، دامنِ حق اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے اور جب انسانی قوتیں جواب دینے لگیں تو ہمیشہ رُوح القدس سے اس کی تائید ونصرت فرمائے اور صراطِ مستقیم پر جہاں لوگوں کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، اسے ثبات واستقامت نصیب فرمائے آمین یارب العالمین۔

فقیر محمد قمر الدین سیالوی

غفر اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ

۱۱ر ربیع الآخر ۱۳۷۳ھ

انتساب

اُن ادب آموز اور رُوح پرور نگاہوں کے نام!

اُن ایمان افروز اور یقین افزا پیاری باتوں کے نام!

اُن بلند عزائم اور پاکیزہ مقاصد کے نام!

محبت کی اُن دلنوازیوں کے نام!

اُن دُعا ہائے نیم شبی اور گریہ ہائے سحری کے نام!

جن سے

پدر بزرگوارم تقدس مآب حضرت پیر **محمد شاہ** صاحب

قدس سرہ العزیز

بھیرہ ضلع سرگودھا پنجاب

نے

اِس مُشتِ خاک کو سرفراز فرمایا

(محمد کرم شاہ)

میری ساری عرضداشت کا حاصل

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو

دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو

صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ
(اقبال)

آغازِ سخن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ رب العلمین الذی منّ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم اٰیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتٰب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین ۔ (و) تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعلمین نذیراً ۔ الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض ولم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیءٍ فقدرہ تقدیراً ۔

وافضل الصلوٰۃ واطیب السلام علیٰ سید الخلق محمد رحمۃ للعلمین الذی ارسل ھادیا للضالین ومرشدا للتائھین ومخرج الناس من الظلمات الی النور کانہ کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولاغربیۃ یکاد زیتھا یضیءُ ولولم تمسسہ نار ۔ نور علیٰ نور ۔ یھدی اللہ لنورہ من یشاء وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و من اتبع سنتہ باحسان الیٰ یوم الدین ۔

اللھم انّی ابریءُ من حولی و قوتی الی حولک و قوتک واسالک الھدایۃ والرشاد ۔ ربّنا اٰتنا من لدنک رحمۃ وھیّیءْ لنا من امرنا رشدا ۔ ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر ۔ انت نعم المولیٰ ونعم النصیر ۔

اما بعد :

خیابانِ ہستی اُجڑا پڑا تھا۔ خزاں کی چیرہ دستیوں سے گلوں کی نکہت افشانیوں
اور عنادل کی نغمہ ریزیوں کی یاد تک بھی گلدستۂ طاقِ نسیاں بن چکی تھیں۔ روشیں
ویران تھیں اور آب جوئیں خشک۔ جہاں کبھی سبزۂ نو دمیدہ جنّت نگاہ ہوا کرتا تھا
وہاں خاک اُڑ رہی تھی۔ یاس و قنوط کی ایک ہمہ گیر کیفیت طاری تھی کہ اچانک
فاران کی چوٹیوں سے ایک گھنگھور گھٹا اٹھی جس کا ہر قطرہ بہار آفریں اور جس کا
ہر چھینٹا فردوس بداماں تھا۔ یہ گھٹا برسی اور خوب دل کھول کر برسی یہاں تک
کہ گلزارِ عالم میں پھر آثارِ حیات نمودار ہونے لگے۔ انسانیت کے پژمردہ چہرے پر
شباب و قوت کی سرمستیاں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ خودداری و عزتِ نفس، شجاعت
و ایثار کے افسردہ درختوں کی عریاں شاخوں کو از سرِ نو خلعتِ برگ و بار عطا ہوئی۔
قمریوں نے پھر عفتِ قلب و نظر کا نغمہ چھیڑا۔ توہمات و عقائدِ باطلہ کے قفس کی
تیلیاں ایک ایک کر کے ٹوٹیں اور ہمائے بشریت کو توحید کی مقدس و مطہر رفعتوں
سے پھر دعوتِ پرواز آنے لگی۔

دنیا والوں نے اس شوخ و شنگ اور خیرات و برکات سے بھرپور گھٹا کو
"محمد" (بہت ہی تعریف کیا گیا) صلی اللہ علیہ وسلم کے دلنواز نام سے پکارا۔ عالمِ بالا
کے مکینوں نے اسے "احمد" (اپنے رب کا سب سے زیادہ ثناخواں) کہا لیکن
حقیقت کی دلفریبیوں سے نقاب اس وقت اٹھا جب اس کے خالق و پروردگار
نے اُسے اپنی کائنات سے یوں رُوشناس کیا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء)

(اے حبیب!) ہم نے تجھ کو تمام جہانوں کے لئے صرف سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اگر انسان اپنے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتا۔ اس چراغِ روشن سے
تاریکیوں کے سینے چیرتا ہوا اس کی دکھائی ہوئی شاہراہ پر عزم و ہمت سے گامزن
رہتا۔ اپنی سبک خرامی کو نفس کی رذیل خواہشات کی زنجیروں سے جکڑ نہ دیتا، تو
کاروانِ انسانیت جو ابھی تک اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ آج اس اعلیٰ و ارفع
منزل تک پہنچ گیا ہوتا جس کی جستجو کی تڑپ اس کی فطرت میں پنہاں ہے۔

لیکن صد حیف! کہ ایسا نہ ہوا۔

آفتابِ ہدایت طلوع ہوا تو

اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

"زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی" دریا و صحرا، کوہ و دمن میں اُجالا
ہو گیا اور ظلمتوں کو ویران گوشوں اور عمیق غاروں کی گہرائیوں کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔
لیکن ان عادی مجرموں کے عشرتکدوں میں صفِ ماتم بچھ گئی جو رات کے گھپ
اندھیروں میں ڈاکے ڈالتے تھے۔ ظلم و استبداد کے تاج و تخت کے وارثوں، اور
مالک و مملوک اور رئیس و مرؤس کے تفرقوں سے اپنی قوت حاصل کرنے والوں کو
اسلام کے عدل و انصاف اور حریت و مساوات کے اصولوں نے آتش زیرِ پا کر دیا۔
وہ چیخ چیخ کر اپنے خداوندانِ باطل سے فریاد کرنے لگے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں را ز دستِ ما ربود
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
انتقام از وے بگیر اے کائنات

(جاوید نامہ)

چشمِ فلک پیر نے وہ بے شمار معرکے دیکھے۔ جب باطل اپنے تمام شکوہ و
جبروت سے مسلح ہو کر حق کی بے سامانیوں سے نبرد آزما ہوا اور ہر بار حق کی قوتِ

یقین سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔

لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ خود مسلمانوں میں ایسے فرقے اور افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کے حصارِ محکم کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں اپنی تمام تر قابلیتیں صرف کر دیں، جن کو ہوسِ جاہ ومال نے یوں مسخر کر لیا کہ وہ ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے سے بھی باز نہ آئے، جنہوں نے اپنی شخصی اور وقتی مصلحتوں پر ملت کے مجموعی اور ابدی مفاد کو قربان کر دیا۔ یہ آزمائش بہت حوصلہ شکن اور رُوح فرسا تھی۔ تاریخ کا ایک ابتدائی طالب علم بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو جو نقصان ان مارہائے آستین کی زہر چکانی سے پہنچا، اس کے سامنے وہ نقصان ہیچ ہے جو تاتاریوں کی بربریت اور فرڈیننڈ[1] کے قتلِ عام سے ہوا۔

یہ سب لوگ مصلحین کا لباس پہنے ہوئے جلوہ افروز ہوئے۔ اُن کی آنکھیں پُرنم تھیں، اُن کے لبوں پر سرد آہ تھی۔ اُن کی زبان غمِ ملت میں مرثیہ خواں تھی۔ اُن کا قلم اُمت کے مصائب پر نوحہ کناں تھا۔ ان کی تقریروں، ان کی تحریروں میں بلا کی فصاحت و بلاغت تھی، لیکن ان کا اندازِ فکر اور طرزِ عمل مفسدانہ تھا۔ ان کا مقصد اُمت کا شیرازہ بکھیرنا تھا۔ ان کے پیشِ نظر اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل تھی۔ ہر ایک نے اپنی بساط واستعداد کے مطابق ملت میں نئی ملت تخلیق کی اور اسی قصر سے اینٹیں اور پتھر اُکھیڑ کر اپنے لئے نئے نئے ایوان تعمیر کئے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے مخلص و پاکباز بندوں کے ذریعہ سے اگر ان مدعیانِ اصلاح وتجدید کا راز فاش نہ کرتی تو معلوم نہیں ان کی کوششیں کیا گل کھلاتیں۔ علماء کرام کے مسلسل جہاد اور پیہم تگ و دو کے باوجود آج بھی بعض فرقے جسمِ ملت پر ناسور

[1] فرڈیننڈ اسپین کے اس بادشاہ کا نام ہے جس کے حکم سے اسپین کے کروڑوں مسلمانوں کو یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا زبردستی عیسائی بنا لیا گیا۔

بنے ہوئے ہیں۔ جو ہر نازک موقعہ پر اس کے لئے کرب و اذیت کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کے ترکش میں ابھی کئی زہر آلود پیکان اور باقی ہیں جو قلبِ مؤمن میں پیوست ہونے کے لئے کسی مشّاق تیرزن کے منتظر ہیں۔ ابھی مسلمانوں کی آزمائش کے لئے بہت سی قیامتیں اس کی قبا میں پنہاں ہیں۔ شاید ؎

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحان آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

انگریزی استعمار نے مرزائے قادیان کی جھوٹی نبوت کی تخلیق کی اور پھر اپنے جبروت واستبداد کی پناہ میں اس کی تربیت و پرورش کرکے ملت کی وحدت پر جو ضرب کاری لگائی اس کا زخم ابھی مندمل ہونے نہیں پایا کہ اب ایک اور فتنہ پَر پُرزے نکال رہا ہے۔ اور یہ ہے

فتنۂ انکارِ سُنّتِ نبوی

منکرینِ حدیث کا کہنا ہے کہ قرآنِ کریم کی وہ تفسیر جو اس ذاتِ اقدس واطہر نے کی، جس کے قلبِ منیر پر اس کا نزول ہوا وہ فرسودہ ہو چکی ہے اس لئے ناقابلِ عمل ہے، انہیں کتاب اللہ کو سمجھنے کے لئے تلمیذِ رحمان اور انسانیت کے معلمِ اعظم کے حضور میں زانوئے ادب تہ کرنے میں خجالت محسوس ہوتی ہے۔

وہ نورِ تاباں، وہ قطروں کو تابشِ آفتاب اور ذرّوں کو تابانئ مہر بخشنے والا نور، وہ بالاؤ پست، کون ومکان کو قبائے ضیا مرحمت فرمانے والا نور جس کے متعلق اُس کے خالق نے فرمایا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (المائدۃ)

بیشک آیا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب۔

وہ نور اب ان کی نظروں میں پرانا ہو چکا ہے۔ اس لئے اب وہ عقل کے ٹمٹماتے ہوئے دیے سے اکتسابِ تنویر کریں گے۔ وہ دیا جس کی لپٹوں میں اٹیم بم کی ویرانیاں اور ہائیڈروجن بم کی بربادیاں سمٹی ہوئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ منکرینِ سنتِ نبویؐ نے نہایت غور و فکر کے بعد یہ قدم اُٹھایا ہے ان کے سامنے اپنے پیش رووں کی فنی غلطیاں ہیں وہ ان کے تلخ تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی کاغذ کی ناؤ کو ان موجوں سے تر نہیں کرنا چاہتے، جنہوں نے اس سے پہلے سینکڑوں کاغذی کشتیوں کو غرق کر دیا۔ وہ اس چٹان سے دامن بچا کر نکلنا چاہتے ہیں، جس سے ٹکرا کر فتنہ و فساد کے کئی سفینے ٹوٹ چکے ہیں۔

وہ یہ جانتے ہیں کہ جب تک جادۂ زیست پر اس کملی والے کے نقوشِ پا موجود ہیں اس وقت تک ان کی قافلہ سالاری کا چراغ نہیں جل سکتا۔ اس لئے وہ ان نقوش کو ناپید کر دینے کے خواہاں ہیں اور جب ایسا نہیں کر سکتے تو ان نقوش کو مشتبہ کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر رہے ہیں۔

انہیں معلوم ہے کہ جب تک زبانِ رسالتؐ قولِ خداوندی کی شارح و مفسر ہے، ان کی تشریح و تفسیر ناقابلِ التفات رہے گی۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اس عقیدہ کو ہی دلوں سے نکال دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شرح و تفسیر کا منصب صرف اپنے برگزیدہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سونپا ہے تاکہ وہ اپنی من مانی تفسیر لوگوں سے منوا سکیں۔

ان سے مخفی نہیں کہ اس تیرہ سو سال سے زائد عرصہ میں شیرازۂ ملت کو پراگندہ کرنے کے لئے جو تحریک بھی اٹھی وہ ارشاداتِ نبویؐ کی صلابت و پختگی سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس لئے وہ اس اندوہناک انجام سے بچنے کے لئے

سنتِ نبویؐ سے جو ملت کی سالمیت کی ضامن ہے، ملت کا رشتہ پہلے سے ہی قطع کر دینا چاہتے ہیں۔

اس خطرناک مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ چند مخصوص ہتھیاروں سے کام لے رہے ہیں جن کے استعمال کے طریقوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن جن کی نوعیت نہیں بدلتی۔ جن کی تفصیل تو بتوفیقہ تعالیٰ آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی یہاں صرف ان کا طائرانہ جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ قارئین حضرات ان نکات کو ہمیشہ زیرِ نظر رکھیں۔

۱۔ وہ اس خیال کو دلوں میں جاگزیں کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم اور سنتِ نبویؐ دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان میں باہمی بہت تباین اور اختلاف ہے۔ ایک پر عمل کرنے سے دوسرے پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بجائے اس کے قرآن کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کیا جائے، یہ ضروری ہے کہ حدیث کو متروک قرار دے کر قرآن پر عمل کیا جائے۔

۲۔ وضعی قوانین جو انسان کی محدود اور اپنے مخصوص ماحول سے متاثر عقل کی پیداوار ہوتے ہیں کیونکہ انہیں استقرار اور دوام نصیب نہیں ہوتا اور وہ ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ اس نظریۂ تطور کو جو انسان کے وضع کردہ قانون کی جوہری صفت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر چسپاں کیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کے لئے وہ اپنا انتہائی زور صرف کر رہے ہیں کہ تشریع قوانین میں نبوت و رسالت کا وہی مقام ہے جو کسی ملک کی مجلسِ قانون ساز کا ہوتا ہے اور نبی و رسول کی وہی حیثیت ہے جو مجلسِ قانون ساز کے کسی رکن کی یا زیادہ سے زیادہ کسی سلطنت کے حاکمِ اعلیٰ کی ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کے اقوال بھی صرف ایک خاص زمانہ

کے لئے مفید ہیں۔ اس کے بعد ان کا ترک کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایک زمانہ میں وضعِ حدیث کی جو وبا پھوٹی تھی اور جس کو اولوالعزم علماء کی مسلسل و پیہم کوششوں نے ابدی نیند سلا دیا تھا۔ اس کچلی ہوئی مُردہ تحریک کو ضد قرار دے کر احادیثِ نبویؐ کے تمام ذخیرے کو موضوع و ناقابلِ اعتماد قرار دینے کی سعی کی جا رہی ہے۔

۴۔ اسلام کے اُن علماء و فضلاء جن پر علم و دانش نازاں ہیں۔ جن کی جرأت و بیباکی استغناء و بے نیازی پر انسانیت فخر کر رہی ہے۔ جن کے اخلاص و للٰہیت کی قسم فرشتے کھا سکتے ہیں ان علماء پر یہ اتہام لگانے میں اپنا زورِ بیان صرف کیا جا رہا ہے کہ وہ جاہل تھے۔ قرآن کریم میں تحریف کیا کرتے تھے۔ اپنے آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف جھوٹی روایتیں منسوب کرتے تھے۔ انہوں نے قوم کے قوائے عملیہ و عقلیہ کو جھوٹی حدیثیں سُنا سُنا کر مفلوج کر دیا تھا۔

اِس طرح وہ اپنی قوم کو اس کی درخشاں و تاباں ماضی سے مایوس بلکہ متنفر کرنے کے بعد ان کے سامنے اپنی قرآن فہمی، خوفِ خدا، حبِ رسولؐ اور دردِ ملّت کی بیتابیوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

یہ ہیں اُن کے وہ چار ستون جن پر اُن کے استدلال کی عمارت قائم ہے یہ ہے اُن کا مرکزی نقطۂ فکر جس کے گرد ان کی جدلی منطق گردش کرتی ہے۔

وہ شخص جس کی نظر قرآنِ کریم پر ہے۔ جس کو احساسِ کمتری نے اپنی قوم کی قابلِ فخر تاریخ سے متنفر نہیں کر دیا۔ جسے علماءِ حدیث کی کامیاب جانفشانیوں کا مطالعہ کرنے کی فرصت ملی ہے۔ اس کے نزدیک تو یہ دلائل بے جان ہیں اور فریب و تضلیل کے اس جال کی عنکبوتی تاروں میں اتنی قوت نہیں کہ اسے

اپنی گرفت میں لے سکیں۔

کاش ہم سب ایسے ہوتے! کاش مِلّت کا ہر فرزند شکوک و شبہات کی یورشوں میں ناقابلِ تسخیر قلعہ ثابت ہوتا۔

لیکن شومیٔ قسمت! کہ ہم میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں شیکسپیئر و برناڈشا کے ڈراموں اور ڈوزوتھ اور ٹینی سن کی پوئٹری نے فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے چشمۂ حیات کی طرف بھی التفات کر سکیں ہم میں ایسے قانون دان بھی ہیں جن کی ساری عمر ہر آن بدلنے والے وضعی قوانین کے مطالعہ میں گزری ہے اور اب وہ ایسے قانون کو جامد اور ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ جس میں ثبات و استقرار ہو۔ خواہ اس کا فیض سورج کی طرح پُرانا، اور اس کی تاثیر سورج کی پرانی کرنوں کی طرح ہر وقت حیات بخش اور رُوح آفرین ہو۔ اس لئے وہ یہ فرق کرنے سے قاصر ہیں جو انسانی تشریع میں ہوتا ہے، جو اللہ کا رسولؐ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔

ہم میں ایسے مورخ بھی ہیں جن کے نزدیک علم و تمدّن کی پہلی تجلّی انقلابِ فرانس کے بعد پھوٹی اور اُن کا خیال ہے کہ اس سے پہلے دُنیا جہالت و توہمات، بربریت و وحشت کی تیرگیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

ایسے حضرات کے نزدیک یہ دلائل ناقابلِ تردید ہیں، یہ نظریۓ مسلّم ہیں اور یہ واقعات تاریخ کی اٹل حقیقتیں ہیں۔ ایسے لوگوں میں "انکارِ سنت نبویؐ" کی تحریک سے متاثر ہونے کا قوی احتمال ہے اس لئے اس کے سدِّباب کے لئے ان بہی خواہانِ ملّت کو ابھی سے کوشش کرنی چاہئے۔ جن کے دلوں میں شریعتِ اسلامیہ کی عظمت ہے اور جن کے نزدیک قوم کی وحدت و سالمیت کی کچھ وقعت ہے۔

میں نے آیندہ صفحات میں اپنی بساط و استعداد کے مطابق یہ سعی کی ہے کہ ان شکوک وشبہات کا تسلی بخش جواب دیا جائے، جو منکرینِ سنت کی طرف سے نہایت شدو مد سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصہ میں اس ناپاک کوشش کا بطلان کیا ہے جو قرآن و حدیث میں تضاد و تبائن ثابت کرنے کے لئے کی جا رہی ہے۔ میں نے یہ واضح کیا ہے کہ قرآن و سنت میں بے مثل ہم آہنگی اور بے نظیر ارتباط ہے اور ان کا باہمی تعلق اجمال و تفصیل اور مفسر و تفسیر کا ہے اور یہ تفصیل و تفسیر بھی ہدایتِ خداوندی کے مطابق کی گئی ہے اور اتباعِ سنت و اتباعِ قرآن دونوں واجب ہیں۔

اس کے بعد اس کذب بیانی کا پردہ چاک کیا گیا ہے جو روایت حدیث اور تدوینِ حدیث کے متعلق نہایت بے باکی سے کی جا رہی ہے۔ وضع حدیث کے فتنے اور اس کے سدِ باب کے لئے علماءِ اُمت نے جو بے مثل جانفشانیاں کی ہیں۔ ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان پاسبانانِ علومِ رسالت و حاملانِ علم و دانش کے مختصر احوال قلمبند کر دیئے ہیں۔ جن کے محیر العقول کارنامے سپہرِ علم و حکمت پر تا قیامت مہر و ماہ بن کر ضو فشاں رہیں گے تاکہ اس سوء ظن کا قلع قمع ہو سکے جو اُمت کے اُن بے لوث محسنوں کے متعلق نہایت زور و شور سے دلوں میں پیدا کیا جا رہا ہے۔

بعد ازیں اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کے علوم کے چند ابتدائی اور بدیہی قواعد بیان کئے گئے ہیں جن سے سنتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریعی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ جن کے جاننے سے بہت سے شکوک و شبہات از خود کافور ہو جاتے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے جن کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

آخری حصہ میں ان اعتراضات کا استیصال کیا گیا ہے جو منکرینِ سنت بعض مخصوص احادیث پر کرتے ہیں، جن میں سے کسی حدیث کو قرآن کریم کے خلاف کسی کو عقل کے مخالف، کسی کو اخلاقی معیار سے گرا ہوا، کسی کو وقتی مصلحتوں کے منافی قرار دے کر ان پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتے ہیں اور بقیہ سنن و احادیث کو بھی ان چند احادیث پر جن کو وہ اپنے زعمِ باطل میں ناقابلِ عمل گردان چکے ہوتے ہیں، قیاس کر کے منسوخ کر دیتے ہیں۔

مجھے اپنی کوتاہ دستی کا پورا احساس ہے پھر بھی مبداءِ فیاض کی ذرہ نوازیوں اور کرم گستریوں سے کامل امید ہے کہ یہ سعی ناتمام ہی سہی، بہت سے شکوک و شبہات کے ازالہ کا باعث ہوگی۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ بجاه حبيبك الكريم عليه الصلوٰة والتسليم۔

میں محترم مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی کا تہ دل سے مشکور ہوں جن کے پیہم تقاضوں نے مجھے اس فرض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود اس کے لئے وقت نکالوں۔

اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ الاستاذ الفاضل القاضی مظہر الدین احمد صاحب بلگرامی (استاذ دینیات جامعہ علی گڑھ) متخصص کلیۃ اصول الدین ازہر کے قیمتی مشوروں نے مجھے اس کتاب کے مرتب کرنے میں بہت مدد دی۔

ابوالحسنات محمد کرم شاہ متعلم قسم التخصص کلیۃ الشریعۃ
الجامعۃ الازہر۔ صفر ۱۳۷۳ھ

منزل ۵۷۔ شارع ۱۰ المعادی
القاہرہ

باب اوّل

اپنا مدعٰی پیش کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان دلائل و براہین کا جائزہ لیا جائے جو سنتِ مصطفٰی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے منکرین کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان دلیلوں کے سمجھ لینے کے بعد ہی ہم پر ان کا موقف واضح ہو سکتا ہے اور ہم اس مقام کی نشان دہی کر سکتے ہیں جہاں ان کو ٹھوکر لگی اور پھر ان کی غلط فہمیوں اور شبہات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

ترکِ سنّت کی دلیل

اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اطاعت اب اُمت پر فرض نہیں۔ وہ جو سب سے مضبوط اور عقلی دلیل پیش کرتے ہیں وہ انہیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

وہ لکھتے ہیں :-

۱ — فطرت انسانی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۲ — اور اُس کے معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اس لئے شریعت مشتمل ہوگی۔

۱ — ان ناقابلِ تغیر جزئیات پر جو قرآن نے خود مقرر و متعین کر دی ہیں اور جو معدودے چند ہیں۔

۲ — اور ان تفاصیل و جزئیات پر جو قرآنی اصولوں کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانہ کی ملّتِ اسلامیہ قرآنی قاعدوں کے مطابق خود وضع کرے گی۔

ان مقدمات کو ترتیب دینے سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جو تفاصیل اور جزئیات متعین فرمائی ہیں وہ صرف اس زمانہ کے لئے تھیں، جب کہ تمدنی اور معاشرتی تقاضے محدود تھے اور وہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتیں اس لئے اس زمانہ کے بعد ارشاداتِ نبوی کی کوئی قانونی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔

وقت کا خلیفہ اور امیر اپنے حالات کے پیشِ نظر احادیثِ نبویؐ کے خلاف حکم صادر کر سکتا ہے اور اس وقت اسی حکم کی تعمیل عین اطاعتِ رسولؐ ہوگی۔

اس دلیل کا رد

ان خداوندانِ علم و دانش کی بارگاہِ ادب میں اگر اذنِ لب کشائی ملے تو ہم بھی عرض کریں کہ آپ کی یہ بات درست ہے کہ فطرتِ انسانی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور اس کے معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ انہوں نے کیسے اخذ کر لیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور حضورؐ کی متعین فرمودہ تفاصیل و جزئیاتِ زندگی کے صرف ایسے تقاضوں کی تسکین کا باعث تھیں جو اس غیر متمدن زمانہ سے مخصوص تھے اور جو اب مرورِ وقت سے بالکل بدل چکے ہیں اور یہ حیاتِ انسانی کی سرمدی اور غیر متبدل تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔

ان کے پہلے دو مقدمے جو واقعی بدیہی ہیں ان سے تو ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا اس تعین کے لئے ایک مستقل دلیل درکار ہے جسے انھوں نے ذکر نہیں فرمایا۔

اوراپنے مخاطب کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر جھٹ یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ کیونکہ بعض معاشرتی اور تمدنی تقاضے ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں اور جو قوانین ان ہنگامی تقاضوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتے ہیں وہ ان تقاضوں کے بدل جانے کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ ایسا ہوتا ہے اس لئے سنتِ نبی اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسلام بھی ایسی ہی ہے۔ وہ خود ہی سوچیں کہ ایسی دلیل سازی سے ایک غور و فکر سے کام لینے والا شخص کیسے مطمئن ہو سکتا ہے؟

اور اگر وہ یہ کہیں کہ اس زمانہ میں سنتِ نبوی کے ناقابلِ عمل ہونے پر عقل شہادت دے رہی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ کیا وہ عقل کے اس فتویٰ کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو اس نے اپنی نارسائی اور حقیقت ناشناسی کے باعث ان جزئیات و تفصیلات کے متعلق صادر فرمایا جو خود قرآنِ کریم نے متعین کی ہیں کیا قرآن کی متعین کردہ حدود، وارثوں کے حصوں کی تقسیم، نکاح و طلاق اور حرمتِ ربا کے احکام پر ہر زمانہ کے عقلمندوں نے اعتراضات نہیں کئے۔ کیا ترکی کے زیرک قانون دانوں نے (جو مسلمان ہی تھے) یہ صاف صاف نہیں کہا کہ وراثت میں مرد کو عورت سے دوگنا حصّہ دینا سراسر عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ جرائم و فحش کاری کے انسداد کے لئے قرآن میں جو صریح طور پر احکام مذکور ہیں جن کی کوئی تاویل بھی نہیں کی جا سکتی کیا اسے وحشت و بربریت کی علامت نہیں قرار دیا جاتا؟ کیا اپنے ماہرینِ اقتصادیات کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا الزام سود کی حرمت پر لگاتے ہوئے بارہا نہیں سُنا؟ تو اگر آپ تقاضوں کی اِس تقسیم میں عقل کا فیصلہ ہی آخری اور اٹل مانتے ہیں تو سنّت تو کجا خود قرآنِ پاک کی بیان کردہ تفصیلات پر بھی خطِ تنسیخ کھینچنا پڑے گا۔

اور اگر آپ یہ فرمائیں کہ ہم ہر اس فیصلہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں جو عقل کے نام سے صادر کیا جائے بلکہ ہم دلائل و براہین سے ثابت کریں گے کہ قرآن کے

تمام احکام اور اُن کی تفصیلات غیر متبدل ہیں اور ہر زمانہ کی ضروریات کی کفیل اور ہر عہد میں انسانیت کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہیں تو اسی طرح ہم بھی ہر اُس شخص کو چیلنج کرتے ہیں جو سنت نبوی کے ابدی طور پر قابلِ عمل ہونے کا قائل نہیں کہ وہ آئے اور شریعتِ اسلامیہ کے کسی ایک حکم کو مقتضائے وقت کے خلاف ثابت کر دکھائے جو سنتِ صحیحہ سے ثابت ہوا ہو۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم صرف عقل کو نہیں جس کی لنگ پائی کا اب اس کے پرستاروں کو بھی اعتراف ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو اپنا حکم تسلیم کرتے ہیں جس کے متعلق اس کے نازل فرمانے والے نے خود فرمایا:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝

ترجمہ: (یہ وہ کتاب ہے) جس میں باطل کا گزر نہ سامنے سے ممکن ہے نہ پیچھے سے، یہ تو حکیم وحمید کی طرف سے اُتری ہوئی ہے۔

تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ قرآنِ کریم اگر یہ حکم دے کہ اللہ کے رسول کی سنت کی اطاعت ہمیشہ کے لئے فرض ہے۔ اور اس کے بیان فرمودہ احکام اور تفصیلات بھی ازلی اور غیر متبدل ہیں تو پھر تو آپ کو بھی انکارِ سنتِ نبوی پر مُصر نہیں ہونا چاہئے۔

اور اگر وہ یہ کہے کہ نہیں اللہ کے رسول کے ارشادات صرف اُس زمانہ میں واجب التعمیل تھے جو غیر مہذب تھا اور اب متمدن زمانہ کی ضروریات کے مطابق آپ خود قرآن کی نئی تفسیر اور اس کے احکام کی نئی تشریح کر سکتے ہیں۔ تو ہمیں اس خدائے غیور کے عزّت و جلال کی قسم جس نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جلال و جمال کا مظہر بنا کر مبعوث فرمایا۔ ہم کسی ادنیٰ تردد کے بغیر آپ کے ہم نوا ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جس وضاحت اور تفصیل سے اپنے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لئے جو مختلف دلکش اسلوب اختیار فرمائے ہیں انہیں دیکھتا ہوں اور پھر ان حضرات کی جن کو قرآن فہمی کا دعویٰ ہے کی افتاد اور اس پر ان کا اصرار دیکھتا ہوں تو حیرت زدہ ہو کر کہہ اُٹھتا ہوں۔

ناطقہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہئے!

اتباعِ سُنّتِ نبوی کے قرآنی دلائل

قرآنِ حکیم میں ایسی بے شمار آیتیں ہیں جن میں علیم و خبیر خدا نے اپنی مخلوق کو اپنے اس برگزیدہ بندے اور مقبول رسول ؐ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور بارہا تنبیہہ بھی فرمائی ہے کہ جس نے اس کی فرمانبرداری سے انحراف کیا وہ اپنے پروردگار کا باغی ہے۔ اس کے انعامات سے محروم اور اس کے غضب و عذاب کا سزاوار ہے چند آیات ملاحظہ ہوں:-

پہلی اور دوسری دلیل

(۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران)

ترجمہ:۔ (اے میرے رسول) تم فرماؤ! اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(اے میرے رسول) تم فرماؤ حکم مانو اللہ کا اور رسول کا۔ پھر اگر وہ اعتراض

کریں تو اللہ کو کافروں سے محبت نہیں ہے۔

یہ ہے قرآن پاک کی آیات بینات کا اعجاز کہ ان کے سامنے شک و ارتیاب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جاتی ہے۔ ان دو آیتوں پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں، ارشاد ہے:-

وہ لوگ جو میرے محبوب رسول کا اتباع نہیں کرتے، اس کے نقشِ پا کو اپنا خضرِ راہ نہیں بناتے اور اس کے ارشادات کے سامنے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے ہوئے سرِ تسلیم خم نہیں کر دیتے اور پھر کہتے ہیں کہ اے رب! ہمارے دل تیری محبت سے سرشار اور سینے تیرے نورِ عشق سے معمور ہیں۔ وہ جھوٹے ہیں، ان کا تو مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر واقعی انہیں مجھ سے اُلفت ہے تو میرے رسول ؐ کا اتباع کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں بھی ان سے محبت کرنے لگوں گا یعنی پہلے وہ صرف محب تھے اور اس دعوئے محبت کی صداقت پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں تھی۔ لیکن جب میرے رسول ؐ کی غلامی کا شرف انہیں حاصل ہو جائے گا، تو ان کا دعویٰ محبت بھی مسلّم اور انہیں خلعتِ محبوبیت بھی مبارک!

محبوبیت حقیقت میں خدا اور رسول کی اطاعت و فرمانبرداری میں پختگی اور ثبات کا نتیجہ ہے اسی حقیقت کی طرف تو حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

چوں تمام افتد، سراپا ناز، می گردد نیاز قیس را لیلیٰ ھمے نامند در صحرائے من

محبتِ الٰہی کی وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ اور يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے الفاظ میں محبت کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ اس پر اگر مزید غور کیا جائے تو حقیقت یوں اجاگر ہو جاتی ہے کہ

پھر کسی کو مجالِ انکار نہیں رہتی۔

محبت کیا ہے؟ بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے کیسی ہوتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے سے، کا کیا معنی ہے؟

محبت کہتے ہیں اُس کشش اور میلان کو جو دل میں کسی باکمال ہستی کی طرف پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کمال جمالِ معنوی ہو یا صوری، حسنِ ظاہری ہو یا حسنِ سیرت وشمائل اور یہ جذبہ اسے اس ہستی سے قریب تر ہونے کے لئے بیتاب رکھتا ہے۔

بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ گلستانِ حسن وخوبی کی ہر پتی اور ہر کلی پر اس ذاتِ احدیت کا جمال جلوہ طراز ہے اور آنکھ جو کمال کہیں اور کسی شکل میں دیکھتی ہے اس کا سرچشمہ وہی ذاتِ صمدیت ہے تو اس کے عشق ومحبت اور اجلال واحترام کی محرابوں کے مصنوعی صنم پاش پاش ہو جاتے ہیں اور اس کے ان تمام جذبات کا مرکز صرف ایک وہی ذات رہ جاتی ہے، اس کا یہ جذبہ کیونکہ ایجابی ہوتا ہے اس لئے اپنے محبوبِ حقیقی کی عبادت اور اطاعت میں عملی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

جذبِ نہاں کی اسی نمود اور ظہور کو محبۃ العبد للہ (بندے کی اللہ سے محبت) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگر خلوصِ نیت اور عزمِ صادق کی زاد لے کر وہ راہِ عشق پر چل نکلے تو بارگاہِ ربوبیت سے جلد ہی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی) کی نویدِ جانفزا سامع نواز ہوتی ہے اسی سرفرازی اور پذیرائی کو اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت کہا جاتا ہے۔

دلِ عاشق میں وصالِ حبیب کے لئے بے قراری کی جو آگ بھڑک رہی ہوتی ہے وہ اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالے خواہ جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے جس سے وصال میسّر ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے عاشقانِ دلفگار کی

رہنمائی نہ فرمائے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عقل وفکر کی قوت سے قربِ الٰہی حاصل کر سکیں کیونکہ ان کی عقل کتنی ہی روشن ہو، بہرحال محدود ہے۔ ان کا فکر کتنا ہی بلند پرواز ہو، بہرحال انسانی فکر ہے اسی لئے رب العلمین نے اپنا رسول بھیجا اور تمام دنیا والوں کو بتا دیا کہ اگر میری رضا وقرب کے خواہشمند ہو اور میرے وصال کے طلبگار ہو تو گمان وتخمین کی دلدلوں میں نہ بھٹکتے پھرو بلکہ میرے رسول کا دامن پکڑ لو۔ اس کے بتائے ہوئے طریقے پر میری یاد کرو۔ اس کے سکھلائے ہوئے اسلوب پر میری عبادت کرو۔ اپنے اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مشکلات کو اس کے ارشادات کے مطابق حل کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (البقرۃ)

ترجمہ:- اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

یہی میری رضامندی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے اور صرف اسی طرح تمہیں میرا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

اب اگر کوئی محبتِ الٰہی کا مدّعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نبی کی اطاعت نہیں کرتا یا تو وہ نادان ہے یا وہ اپنے دعوئ محبت میں جھوٹا ہے۔

اسی پر ہی اکتفا نہیں بلکہ اتباعِ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزید برکات وخیرات کا بھی ذکر فرمایا کہ

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

کہ اطاعتِ رسول کی برکت سے تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ تمہاری لغزشوں اور کوتاہیوں پر قلمِ عفو پھیر دی جائے گی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قوموں

پر خدائے قہار کا عذاب ان کے گناہوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ قیامت خیز قحط، ہلاکت آفریں جنگیں اور تباہ کن امراض کے شکنجہ میں قدرت بلاوجہ نہیں کس دیتی بلکہ یہ انسان کی اپنی بداعمالیوں کا طبعی ردِعمل ہوا کرتا ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

ترجمہ:۔ یہ بدلا ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔

لیکن اطاعتِ رسولِ عربی وہ اکسیر ہے جس سے جاں بلب مریض شفایاب ہوجاتا ہے، اس کے اعجاز سے ان قوموں کو تاجِ سروری عطا کیا جاتا ہے جو قعرِ مذلت میں مدتوں سے پڑی سڑ رہی ہوتی ہیں۔ اسی کے صدقے ان امتوں کو حیاتِ نو اور ذوقِ عمل مرحمت کیا جاتا ہے، جو اپنی سست گامی سے زندگی کی دوڑ میں شکست کھا چکی ہوتی ہیں ؎

توچناں ہمائی اے جاں کہ بزیرِ سایۂ تو   بکف آورند زاغاں ہمہ خلعتِ ہمائی

ایک قلبِ سلیم کے لئے تو اس روشن دلیل اور واضح برہان کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں لیکن دبیرِ ازل کے قلمِ معجز نگار نے کیونکہ اس مضمون کو مختلف اداؤں سے پیش فرمایا ہے اس لئے ان سے متمتع ہونا بھی عین سعادت ہے۔

تیسری دلیل

اللہ تعالیٰ سورۃ النساء، پارہ چہارم میں ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو حکم مانے اللہ اور اُس کے رسول کا، اللہ اُسے

باغات میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ دنیا دارالعمل ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز تمام مخلوقات کو پھر زندہ کیا جائے گا۔ اور ان کے اعمال نیک و بد کا محاسبہ ہوگا۔ اطاعت کیش اور پاکباز جنت کی ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور سرکشوں اور متکبروں کو دوزخ کا ایندھن بنایا جائے گا۔ اس جہاں میں ہمارا مقصدِ زیست شوکت و سطوت جاہ و منصب اور عیش و نشاط کے حصول تک محدود نہیں، گو ہم ان سے دستکش ہونا بھی کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔ ہمارا عقابِ ہمت اس عالمِ آب و گل کے کہستانوں میں آشیانہ نہیں بناتا۔ اس کا نشیمن تو فردوسِ اعلیٰ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔

ہماری حقیقی کامیابی یہی ہے کہ ہم قیامت کے روز بارگاہِ الٰہی میں سرخرو ہوں اور اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور یہی سب سے بڑی کامرانی کی علتِ تامہ ہے، گویا اللہ تعالیٰ کے سرمدی انعامات کے مستحق صرف وہی خوش نصیب ہیں جنہوں نے فرمانِ مصطفوی کو دل و جاں سے تسلیم کیا۔

چوتھی دلیل

اطاعتِ رسول ؐ اور اس کی گوناں گوں برکات بیان کرنے کے ساتھ حضور کریم ؐ کی نافرمانی سے روکا سورۃ مجادلہ میں ارشاد ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! تم جب آپس میں مشورہ کرو تو گناہ کرنے، حد سے بڑھنے اور رسول ؐ کی نافرمانی کا مشورہ نہ کرو اور نیکی اور پرہیزگاری کا مشورہ

کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ کس دلکش اور محبت بھرے انداز میں مسلمانوں کو ایسی سرگوشیوں سے روکتے ہیں جن میں فسق و تعدی اور فخر الرسل کی نافرمانی کی سازش کی جائے اور ساتھ ہی تنبیہ فرما دی کہ یہ تمہاری سرگوشیاں مجھ سے اوجھل نہیں اگر تم باز نہ آئے تو قیامت کے دن تمہیں رسوا کیا جائے گا۔

اسلامی حکومتوں کے اربابِ حل و عقد اور مجالس دستور ساز کے ارکان مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران اس آیت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس وضاحت سے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ سنت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کوئی آئین یا قانون بنانے کا انہیں کوئی اختیار نہیں۔ اسلامی مملکت کے صدر، وزیر اعظم اور افسران کسی خود ساختہ مصلحت کی وجہ سے ترکِ سنت کے مجاز نہیں۔

پانچویں دلیل

کئی مقامات پر رب العزت نے دوزخ کی آگ میں جلنے والوں اور عذابِ خداوندی میں گرفتار بدنصیبوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ اس وقت کفِ افسوس ملتے ہوئے اور اشک ندامت بہاتے ہوئے نہایت حسرت سے اپنے جرم کا اعتراف بدیں الفاظ کریں گے:

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللّٰهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا (الاحزاب ۶۶)

ترجمہ: جس دن ان کے منہ الٹ الٹ کر آگ میں تلے جائیں گے۔ کہتے ہوں گے کاش! ہم نے خدا کی اطاعت کی ہوتی اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔ ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

چھٹی دلیل

اور کہیں گے جب کہ ان کا یہ کہنا انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا ۝ (النساء ۴۲)

ترجمہ: اس دن تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسولؐ کی نافرمانی کی، کاش! انہیں مٹی میں دبا کر زمین ہموار کر دی جائے۔ اور کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔

ساتویں دلیل

مندرجہ ذیل آیت سورۃ توبہ کی ہے آپ اسے پڑھئے اور غور کیجئے کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا کیا عالم ہے جو نور مجسم ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہیں سمجھے اور فرزندانِ توحید کو انہیں کون سی سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صٰغِرُونَ ۝ (توبہ ۲۹)

ترجمہ: لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اُس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دیئے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت کھلے طور پر یہ بیان کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی اطاعت اور سنتِ نبی کریمؐ کی اطاعت مساوی طور پر فرض ہے اور جو سزا قرآن سے سرتابی کرنے والے کی ہے اسی سزا کا مستحق سنتِ نبویؐ کا منکر ہے۔

آٹھویں دلیل

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ

رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (النساء ۶۱)

ترجمہ: اور جب ان کو (جو ظاہر میں مسلمان ہونے کے مدعی ہیں) کہا گیا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور اس کے رسولؐ کی طرف۔ تو تم نے دیکھا منافق کو وہ تم سے دور ہٹتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں وہ بھی منافق ہے جو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی کوئی مسلمان تو سنت سے انحراف کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سنت سے انحراف تو فقط منافقین کا شیوہ ہے۔

نویں دلیل

کیونکہ اطاعتِ رسول رشد و ہدایت کی کفیل ہے اسی سے انسان روزِ محشر کی ندامت سے محفوظ ہو سکتا ہے یہی بابِ جنت کی کلید ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ وسیع کا حقدار انہیں لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو اطاعتِ رسولؐ میں کوشاں رہتے ہیں۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الخ (الاعراف ۱۵۶-۱۵۷)

ترجمہ:۔ اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ سو اُس کو لکھ دوں گا ان کے لئے جو متقی ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسولؐ کو جو نبی امی ہے۔ الخ

اطاعت اور اتباع کے معانی کی تحقیق

کیونکہ ان تمام آیات میں جہاں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کا حکم ہے۔ اطاعت اور اتباع کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ بحث ختم کرنے

سے پہلے لفظ اطاعت و اتباع کی تحقیق کرلینی چاہئے تاکہ کسی قسم کا لفظی نزاع بھی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔

عربی زبان میں اتباع کہتے ہیں کہ کسی شخص کے پیچھے پیچھے چلنا چنانچہ ابن منظور نے اپنی لغت کی شہرۂ آفاق کتاب "لسان العرب" میں اس کی یوں تحقیق کی ہے:

قال الفراء الاتباع ان يسير الرجل وانت تسير وراءه واذا قلت اتبعته فكانك قفوته[1]

ترجمہ:۔ فراء (لغت و نحو کے امام) نے کہا کہ اتباع کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص آگے آگے چل رہا ہو اور تو اُس کے پیچھے پیچھے چلے اور اگر تو کہے کہ میں نے اس کی اتباع کی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اُس کے پیچھے پیچھے اور اس کے نقشِ قدم پر چلا۔

صاحبِ "تاج العروس" نے اس مفہوم کو ذکر کرنے کے ساتھ چند ایک اور الفاظ بھی لکھے ہیں جن سے اتباع کا معنی اور زیادہ واضح اور روشن ہو جاتا ہے مثلاً

التُّبَّع وكذلك التَّبَّع كسُكَّر الظل سمى به لانه يتبع الشمس حيثما زالت ومن المجاز التبع ضرب من اليعاسيب اعظمها واحسنها[2]

ترجمہ: التُّبَّع اور التَّبَّع (جن کا مادۂ اشتقاق تبع ہے) کا معنی سایہ ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سورج کے پیچھے پیچھے رہتا ہے اور التبع مجازاً شہد کی مکھیوں کے سب سے اعلیٰ اور بہتر نر کو بھی کہتے ہیں (کیونکہ سب شہد کی مکھیاں اس کے پیچھے پیچھے رہتی ہیں)۔

اور اس کا اصطلاحی معنی امام ابوالحسن الامدی نے یوں بیان کیا ہے:

واما المتابعة فقد تكون فى القول وقد تكون فى الفعل والترك

[1] لسان العرب فصل التاء من باب العین ۱۲
[2] تاج العروس فصل التاء من باب العین۔

فاتباع القول هو امتثاله على الوجه الذى اقتضاه
القول والاتباع فى الفعل هو التأسى بعينه۔[1]
والتأسى ان تفعل مثل فعله على وجهه من اجله۔[2]

ترجمہ: متابعت کبھی کسی کے قول کی ہوتی ہے اور کبھی کسی کے فعل و ترک کی، کسی کے قول کے اتباع کا معنی تو یہ ہے کہ اپنے متبوع کی اس طرح فرمانبرداری کی جائے جس طرح اس کے قول کا تقاضا ہو اور کسی کے فعل کے اتباع کا معنی یہ ہے کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لئے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے۔

'اتباع' کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق سے یہ واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کے متعلق جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اس کی تعمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کے اقوال پر اس طرح عمل کریں جیسا ان اقوال کا تقاضا اور منشا ہے، اور حضورؐ کے افعال کو اس طرح ادا کریں جس طرح حضورؐ نے ادا فرمائے اور اس لئے ادا کریں کیونکہ حضورؐ پر نور نے ان افعال کو ادا فرمایا۔ اگر ہم حضور کریمؐ کے ارشادات پر اس طرح عمل نہ کریں جیسے ان کا تقاضا ہے یا افعالِ رسالتؐ کو اس طرح ادا نہ کریں جیسے حضورؐ نے ادا کئے یا اس لئے ادا نہ کریں کہ حضور اکرمؐ نے انہیں ادا کیا تو پھر اتباعِ نبویؐ سے جس کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے بارہا حکم فرمایا ہے، ہم محروم رہیں گے۔

اتباع کا معنی سمجھ لینے کے بعد اب ذرا لفظ اطاعت پر غور فرمائیے:

عربی زبان میں اطاعت کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

وفى التهذيب وقد طاع له يطوع اذا انقاد له بغير الف

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ا ص۸۹ [2] ایضاً ص۸۸

فاذا مضى لامره فقد اطاع۔[1]

ترجمہ: تہذیب (لغت کی ایک مستند کتاب) میں ہے کہ قد طاع له يطوع (جب کہ ثلاثی مجرد ہو) کا معنی ہے کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا اور جب کوئی کسی کے حکم کی تعمیل کرے تو کہتے ہیں (قد اطاعه) یعنی اس نے اس کی اطاعت کی۔

اور اطاعت کا اصطلاحی معنی امام ابوالحسن الآمدی نے یہ لکھا ہے۔

ومن اتى بمثل فعل الغير على قصد اعظامه فهو مطيع له۔[2]

یعنی جب کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت و احترام کے باعث بعینہٖ اس کے فعل کی طرح کوئی فعل کرے تو کہتے ہیں کہ یہ شخص فلاں شخص کا مطیع ہے۔

تو گویا اہلِ عرب جن کی زبان میں قرآنِ کریم نازل ہوا اطاعت کا لفظ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کہ کسی کے حکم کی تعمیل کی جائے اور اس کی عزت و احترام کی وجہ سے بعینہٖ ایسا کام کیا جائے جیسا اس کام کو وہ معزز و محترم شخص کرتا ہے۔

اطاعتِ رسول کے حکمِ الٰہی کی تعمیل کی واحد صورت

اب جن آیاتِ قرآنی میں اطاعت و اتباعِ رسولؐ کی بار بار تاکید کی گئی ہے ان پر عمل فقط اسی صورت میں ہوگا کہ آپ ایسا کریں جیسے وہ رسولؐ کرتا ہے یعنی جیسے وہ نماز پڑھتا ہے اسی طرح، انہیں اوقات پر اتنی ہی رکعتیں ادا کریں، حج کی جو عملی تصویر وہ پیش کرتا ہے بعینہٖ اس کا چربہ اتاریں۔ زکوٰۃ کے نصاب اس کی شرح وغیرہ کے جو اصول اس نے سکھائے ہیں بلاچون وچرا ان پر عمل پیرا رہیں۔ لین دین،

[1] لسان العرب فصل الطاء من باب العين۔
[2] الاحکام فی اصول الاحکام ج ا ص۹۱ (طبع صبیحی)۔

نکاح وطلاق، اخلاق ومعاشرت کے جو ضوابط اس نے مقرر فرمائے ہیں ان پر بطیبِ خاطر کاربند رہیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو واقعی آپ نے اس کی متابعت کی اور اپنے رب کا حکم مانا۔ لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنی فہم و دانست کے مطابق تعلیماتِ اسلامی کو نت نئی شکلوں میں پیش کر کے اپنے شوقِ تجدید پسندی کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں تو یہ بلاشبہ اتباعِ ہوس واطاعتِ نفس تو ہو گی لیکن آپ اسے کسی تاویل کی قوت سے بھی اطاعتِ رسول اور اتباعِ سنت نہیں کہہ سکتے۔

اب اُن حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ التماس ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سنت کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی کلام پاک میں جسے وہ بھی قیامت تک کے لئے غیر تغیر پذیر مانتے ہیں اور اس کی مقرر کردہ جزئیات کو بھی غیر متبدل تسلیم کرتے ہیں، یہ فرماتا ہے:

گناہوں کی آمرزش چاہتے ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

میری محبت کے دعویدار ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

جنت کے طلب گار ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

میرے محبوب بننا چاہتے ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

میرے دامنِ رحمت میں پناہ چاہتے ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

اور جس وقت تمہیں کسی خطۂ زمین میں غلبہ وتمکین عطا فرماؤں اور تم مجالسِ دستور سازی میں وضعِ آئین وقوانین کے لئے اکٹھے ہو تو میرے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

ورنہ

قیامت کے دن ہونٹ کاٹو گے۔

اپنے تمرد وسرکشی پر پچھتاؤ گے۔

اپنے وجود تک سے بیزاری کا اظہار کرو گے۔

لیکن کوئی عذر نہیں سُنا جائے گا۔

اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں اب ہمیں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والثناء کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ اطاعتِ رسولؐ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارا حکم واجب التعمیل ہے اور ہماری سنت قابلِ تقلید۔

قرآن کے اصولوں اور اس کی تفصیلات کو اٹل اور دائمی کہنے والے اب ان آیات کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ کیا یہ آیتیں ان کے نزدیک قرآن پاک کی نہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا نازل فرمایا ہوا کلام نہیں؟ ان کو وہ کیوں غیر متبدل نہیں سمجھتے؟ کیا یہ آیاتِ محکمات منسوخ ہو چکی ہیں؟ یا ان کے معانی بدل چکے ہیں؟ ایک مفتری نے حرمتِ جہاد کا فتویٰ صادر کر کے اُمتِ مصطفوی کے قوائے عمل ونشاط کو مفلوج کرنا چاہا تھا تاکہ اپنے محسن آقا کے سامنے اپنی نیاز مندی اور وفاداری کا ثبوت پیش کر سکے، جس کے فکرِ فتنہ ساز نے اس کے لئے نبوت تخلیق کی۔ جس کے دجل وفریب سے اس کے باطل کو تقویت ملی۔ جس کے مکر وخداع نے اسے دامِ ہمرنگِ زمین بخشا۔ اور جس کی بخششہائے بے اندازہ نے اسے مال وجاہ کے پجاریوں کا قاضی الحاجات بنا دیا۔

لیکن زمین وآسمان کا خدا شاہد ہے کہ وہ اپنی وسیسہ کاریوں میں ناکام رہا، اُمتِ محمدیہ کے دلوں سے جہاد کا جذبہ مٹ نہ سکا۔ راہِ حق میں مرنے کی تڑپ کم نہ ہوئی۔ اسلام کا پرچم بلند رکھنے کے عزم میں ضعف نہ آیا۔ میدانِ سرفروشی میں نعرۂ توحید بلند ہوتا رہا اور شہادت گاہِ عشق میں آقائے بدر وحنین کے غلام اپنا دل وجان نثارِ ابروئے جاناں کرتے ہی رہے اور جب تک چشمِ آفتاب روشن ہے وہ یہ نظارہ دیکھتی رہے گی۔

اب یہ ملت کے نئے دردمند اور بہی خواہ صرف ایک چیز سے نہیں بلکہ اسلام کے ان تمام اصولوں کو ناقابلِ عمل ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہیں جن کا سرچشمہ ذاتِ محمد

مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اس کے احکام میں ردّو بدل ناممکن ہے لیکن اگر وہی قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالٰے کے پیارے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کرو اور صرف ایک بار نہیں بلکہ سینکڑوں بار کہتا ہے تو پروا نہیں کرتے اور یہی کہتے ہیں کہ نہیں اطاعتِ رسول کا زمانہ ختم ہو گیا اب ہم پر بلکہ ساری اُمّت پر رسولؐ کی اطاعت فرض نہیں رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ دامنِ مصطفویؐ ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد کوئی کتنا ہی چابک دست ہو حبل اللہ (قرآن) کو نہیں تھام سکتا۔ جن کے لئے نقشِ پائے مصطفٰی دلیلِ راہ نہیں اُن کے لئے سر دشِ غیب بھی بے معنی ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ تشریعی (سنت طبعی نہیں) میں جو اصول اور جو احکام مذکور ہیں زمانے کے بدلتے ہوئے احوال اس کے دامنِ ابدیت کو نہیں چھو سکتے۔ شب و روز کا غیر منقطع تسلسل ان کی زندگی بخش اور شباب آفریں قوتوں کو مضمحل نہیں کر سکتا۔ گردشِ لیل و نہار ان کی افادیت اور صلاحیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یقینِ محکم ہے کہ قرآن کریم کے دوسرے اصول اور تفصیلات جس طرح ابدی اور دائمی ہیں اسی طرح اطاعت رسالتؐ کے متعلق جو حکم ہے، وہ بھی قیامت تک کے لئے واجب العمل ہے۔

ایک شُبہ کا ازالہ

کسی شخص کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے وہ اپنی ذات اور اسی طرح اپنی تمام صفات میں بے مثال ہے، وہ عرش و فرش، بالا و پست، بحر و بر، نور و ظلمت غرض کہ ہر اُس ذرہ کا جسے اس نے خلعتِ وجود سے نواز ا ہے بلا شرکت غیر مالک و مختار ہے۔ اسی کے حکم سے فلکِ نیلگوں کا سائبان

بغیر سہارے تنا ہے اسی کے حکم سے سورج اور چاند کو ردائے نور، ستاروں کو تنک تابی اور دریاؤں کو روانی مرحمت کی گئی ہے اور اسی کی اجازت سے نبضِ ہستی سرگرم خرام ہے پھر اس کی اطاعت کے بغیر کسی اور کی اطاعت کا کیا معنی؟ جب وہ خود فرماتا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں) تو صرف اسی کا ارشاد واجب الانقیاد ہو گا۔ سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کی دولت فقط اسی کے آستانۂ قدوسیت پر جبیں فرسا ہونے کا ثمر ہے، تو پھر یہ دوئی (DUALISM) یعنی خدا کی اطاعت کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت کیسی؟

اگر متذکرہ بالا آیات اور ایسی دیگر آیات قرآنِ کریم کے صفحات کی زینت نہ ہوتیں تو شاید اس شبہ میں کچھ وزن ہوتا۔ ان آیات کو خدا کا کلام یقین کر لینے کے بعد تو قلبِ مؤمن میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین اور غیور بادشاہ ہے جو اپنی سلطنت میں کسی غیر کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتا اور جہانبانی اور حکمرانی کا حق صرف اپنے لئے محفوظ کیا ہے تو پھر اس کا ہر حکم خواہ اس کی حکمت و غایت کے ادراک سے ہماری فہم نارسا عاجز بھی رہے واجب الامتثال ہے، اور جب اسی نے بار بار یہ حکم دیا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ تو پھر مجال دم زدن کہاں اور یارائے قیل و قال کسے۔ اب اس میں تامل کرنا گویا اس کے حکم کے خلاف بغاوت کرنا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت دو علٰحدہ اطاعتیں ہیں ہی نہیں تاکہ یہ سوال پیدا ہو۔ بلکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسولؐ کی فرمانبرداری، خدا کی فرمانبرداری، یہ بھی میں نہیں کہتا بلکہ اسی رب ذوالجلال کا ارشاد ہے جس نے سارے عالم کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے اپنے ایک نہایت ہی برگزیدہ بندہ پر قرآن نازل فرمایا ارشاد ہے:

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (النساء ۷۹۔۸۰)

ترجمہ:۔ اور (اے محبوب) ہم نے تمہیں سب لوگوں کے لئے رسول بھیجا۔ اس پر خدا کی گواہی کافی ہے، جس نے رسولؐ کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا اور جس نے منہ پھیرا تو ہم نے تمہیں اُن کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔

اس نصِ محکم کے بعد اطاعتِ نبوی کو اطاعتِ خداوندی سے الگ تصور کرنا آیاتِ قرآنی سے جہالت و بیگانگی کی دلیل ہے۔

حکمتِ قرآن اور سُنّتِ نبویؐ

ایک معنٰی کی دو۲ تعبیریں

منکرینِ سنّتِ نبویؐ کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فقط قرآنِ حکیم عطا ہوا ہے اس کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں ہوئی اور سنت حضورؐ کے اپنے فکر و نظر کی تخلیق ہے اور یہ مُنزّل من اللہ نہیں اور اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کیونکہ سنّت حضورؐ کے ذاتی اجتہاد کا ثمر ہے اس لئے یہ فقط اُن مخصوص حالات میں ہی مشعلِ راہ کا کام دے سکتی تھی اور دوسرے انسانوں کے افکار و آراء کی طرح یہ بھی زمانہ کے ہر لحظہ بدلنے والے اور ترقی پذیر تمدّنی، اقتصادی اور معاشرتی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے متروک العمل ہے اور ہمارے لئے یہ کسی طرح حجت نہیں اور خدا و رسولؐ کا منشا بھی یہی تھا کہ یہ آیندہ نسلوں کے لئے حجت نہ بنے اس وقت ہمارے لئے اس میں اس کے تاریخی

پہلو کے علاوہ کوئی جاذبیت نہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِک)۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے قرآن کو کبھی دقّتِ نظر سے نہیں دیکھا اور وہ تدبّر اور جگر کاوی جس کی قرآن نے اپنے پڑھنے والوں کو دعوت دی ہے اور یہ خود بھی بار بار اس پر زور دیتے رہتے ہیں۔ کبھی سنجیدگی سے قرآن کو اس کا مستحق نہیں سمجھا۔ ورنہ ان سے ایسی فحش غلطی کبھی سرزد نہ ہوتی۔ آئیے! قرآن کی روشنی میں اس الجھن کا حل تلاش کریں یقیناً گوہرِ مقصود دامنِ طلب کی زینت بنے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسلام کی بعثت کا تذکرہ فرمایا وہاں دو۲ چیزوں کا ساتھ ساتھ ذکر فرمایا۔

۱۔ کتاب اور ۲۔ حکمت مثلاً

۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران ۸۱)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے یہ عہد لیا تھا کہ جب وقت میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔ فرمایا، کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا، سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا، تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔

یہ عہد اللہ تعالیٰ نے ارواحِ انبیاء عظام سے لیا تھا کہ جب میں تمہیں خلعتِ نبوت سے سرفراز کروں اور تمہیں کتاب اور حکمت عطا کروں۔ تو جس وقت میرا

محبوب زینت بخش بزم کون ومکان ہو تو تم اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی اعانت میں بھی کوشاں رہنا۔ اس آیت مطہرہ میں جو اور اسرار ونکات ہیں اس وقت میں انہیں بیان نہیں کرتا، میں جو چیز اس وقت واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو صرف کتاب دینے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ حکمت کا بھی کتاب کے ساتھ وعدہ فرمایا تو گویا ہر نبی کو کتاب کے ساتھ حکمت بھی بخشی گئی اور جس طرح کتاب خدا کی طرف سے ہے اسی طرح حکمت بھی منزّل من اللہ ہے۔

۲۔ سورۃ النساء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○ (النساء ۱۱۳)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے (اے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور آپ کو سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر بڑا فضل ہے۔

تو پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب ہی اپنے رسول پر نازل نہیں فرمائی، بلکہ حکمت بھی نازل فرمائی ہے۔

اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت اور انبیا ورُسل کے بعثت کی غرض وغایت بیان فرمائی وہاں یہ بھی تصریح کی ہے کہ ان کا کام اُمت کو کتاب اور حکمت سکھانا ہے مثلاً سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ ۱۵۱)

ترجمہ: جیسا ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت

کرے اور تمہیں پاک کرے اور تمہیں سکھائے کتاب اور حکمت، اور سکھائے تمہیں وہ علم جو تم نہیں جانتے۔

دوسرے مقام پر جہاں بعثتِ مصطفوی کو مخلوقات پر اپنا عظیم الشان احسان فرمایا، وہاں بھی ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (اٰل عمران ۱۶۴)

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا ایمان والوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں (کفر وگناہ کی آلودگی سے) پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔[1]

---

[1] اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام ہے وہ جسم اور روح دونوں کا پروردگار ہے یہ گنبدِ نیلوفری اور اس میں آویزاں یہ کروڑوں قندیلیں، یہ کرۂ ارضی اس کے فلک بوس پہاڑ اور ان سے اُبلتے ہوئے چشمے، بہتی ہوئی ندیاں اور پُرشور دریا، ان کی گل فروش وادیاں اور سبزہ زار ڈھلوانیں۔ یہ ہموار میدان اور ان میں لہلہاتے ہوئے کھیت اور یہ جنت نگاہ باغات اور پھر یہ ہوا کا محیطِ بیکراں اگر اس کے رب الاجسام ہونے کے آئینہ دار ہیں تو صدفِ نور وضیاء کا یہ درِ یتیم، برجِ سعادت کا یہ کوکبِ تاباں، مطلعِ رشد وہدایت کا یہ مہتاب، آسمانِ رسالت کا یہ مہرِ نیمروز محمد عربی (فداہ روحی وقلبی) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رب الارواح ہونے کا مظہرِ اتم ہے ؎

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

اور کیونکہ روح اشرف واعلیٰ ہے جسم سے، اس لئے وہ چیز جو (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

یہاں بھی ارشاد فرمایا کہ ہم نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں ایسا رسولؐ بھیجا جو (دیگر امور کے علاوہ) انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ ازواجِ سید المرسلین کو حکم فرماتا ہے کہ

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ط

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (الاحزاب ۳۴)

ترجمہ: اور یاد کرو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں۔ اللہ کی آیتیں اور حکمت اللہ تعالیٰ ہر باریکی جانتا خبردار ہے۔

اُمہات المؤمنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہن کو فقط کتاب کے یاد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ کتاب کے ساتھ حکمت کا بھی۔

اس تفصیل سے مقصد تو یہ ثابت کرنا ہے کہ نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو چیزیں کتاب وحکمت عطا ہوتی ہیں اور وہ اپنی امت کو خدا کی دی ہوئی یہی دو چیزیں سکھاتا ہے۔

(گزشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) انسان کی روحانی حیات و بالیدگی کی ضامن ہے افضل وبرتر ہوگی اس چیز سے جس کے ساتھ اس کی جسمانی بقا اور نشوونما وابستہ ہے تبھی تو رب العالمین نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کو اپنا احسانِ عظیم قرار دیا۔

انسان نے اگرچہ اب چراغوں سے فانوس اور فانوسوں سے برقی قمقمیں روشن کرلئے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی صحت وسلامتی کے لئے اسی پرانے چاند اور سورج کا محتاج ہے اور تاقیامت محتاج رہے گا۔ اسی طرح وہ اپنی قوت فکر ونظر سے کتنی ہی شمعیں کیوں نہ جلالے وہ اس نور سے مستغنی نہیں ہوسکتا جو انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ساتھ اور اپنی کتاب سمجھنے کے لئے انسان کو عطا فرمایا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس دو چیزیں آئیں ایک نور یعنی ذاتِ رسالت مآب اور دوسری کھلی اور روشن کتاب۔ (قرآن)

لفظِ حکمت کے مفہوم کی تحقیق

اب دیکھنا یہ ہے کہ 'حکمت' ہے کیا؟ اس کا لغوی مفہوم کیا ہے؟ اور قرآنی اصطلاح میں اس کا کیا معنی ہے؟

حکمت کا مادہ ہے حکم اور حکم کا معنی ہے منع منعا للاصلاح[1] کسی کی اصلاح کے لئے کسی کو کسی امر سے باز رکھنا۔ اسی لئے لگام کو بھی حَكَمَةٌ کہتے ہیں کیونکہ اس سے گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔ ایک مصرع ہے۔

ابنی حنیفہ احکموا سفہائکم

اے بنی حنیفہ (عرب کے ایک قبیلہ کا نام ہے) اپنے احمقوں کو شرارت سے روک لو۔

اسی مناسبت سے حکمت کہتے ہیں وضع الاشیاء مواضعہا۔ یعنی اشیاء کو اپنے صحیح محل پر رکھنا۔ اور ان کو غیر صحیح محل پر استعمال کرنے سے روکنا۔

صاحبِ تاج العروس نے مزید تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے،

الحکمۃ العدل فی القضاء والعلم بحقائق الاشیاء علیٰ ما ھی علیہ والعمل بمقتضاہ ولھذا انقسمت الی علمیۃ وعملیۃ[2]۔

یعنی کسی جھگڑے کا عادلانہ فیصلہ کرنے کو حکمت کہتے ہیں، کیونکہ مدعی اور مدعی علیہ کے متضاد بیانات اور دلیلوں سے حقیقت شکوک وشبہات کے پردہ میں پنہاں ہوجاتی ہے اس پردہ کو ہٹا کر حقیقت کو وانشگاف کر دینا اور صاحب

---

[1] مفردات راغب۔

[2] تاج العروس فصل الحاء من باب المیم۔

حق کو اس کا حق دلانا عدل ہے اور یہی حکمت ہے اس کا دوسرا معنی اشیاء کی
صحیح حقیقت کو جان لینا اور اس صحیح علم کے مطابق اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اسی لئے
حکمت کی دو قسمیں ہیں، حکمت علمی یعنی اشیاء کی ماہیت وحقیقت کا صحیح علم اور دوسری
قسم حکمتِ عملی یعنی اس صحیح علم کے تقاضا کے مطابق اس پر عمل پیرا ہونا۔

اب جب ہم نے حکمت کا وہ مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جو اہل لسان اس سے
مراد لیتے ہیں، تو اب ان آیات کی طرف غور کریں جن میں الکتٰب والحکمۃ کا ساتھ
ساتھ ذکر ہے، ان آیات میں لفظ کتاب کے بعد جو لفظ حکمت مذکور ہے۔ اس
سے مراد حکمتِ کتاب ہے یعنی کتاب (قرآن) میں جو اوامر و نواہی، جو احکامات و
ارشادات، جو دروس وعبر، جو پند و نصائح مذکور ہیں ان کی ماہیت وحقیقت کا صحیح
صحیح علم اور ان پر صحیح صحیح عمل۔ یہ صحیح علم اور صحیح عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول
کو کتاب کے ساتھ عطا فرمایا جاتا ہے۔ اسی طرح رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی
کتاب کا علم وعمل اللہ تعالیٰ نے ہی مرحمت فرمایا اور یہی حضور کریمؐ کا علم وعمل ہے
جس کی تعبیر سنت سے کی جاتی ہے، اگر ان حضرات کو لفظ سنت سے بیر ہے
اور اتباعِ سنتِ نبویؐ سے چڑ ہے تو وہ حکمت اور اتباع حکمتِ نبویؐ کے الفاظ
استعمال کرلیں۔ بہرحال انہیں قرآن پر عمل کرنے کے لئے حضورؐ کے اقوال و
اعمال پر عمل کرنا ہی پڑے گا اور طوعاً وکرہاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سنت یا حکمت
قرآن بمطابق آیاتِ سابقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر
نازل ہوئی۔

اور قرین قیاس یہی ہے کہ حکمت یعنی سنت منزل من اللہ ہو کیونکہ اگر
کتاب اللہ کے احکام کے مصداق و مدلول کا تعین عقلِ انسانی کے سپرد کردیا
جائے تو احکامِ الٰہی اہلِ خرد کی موشگافیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور اُمّت کی

وحدت ویک جہتی جو اس کی زندگی کی کفیل اور بقا کی ضامن ہے کسی ٹھوس اور مضبوط
نظامِ حیات کی غیر موجودگی کے باعث تشتت وافتراق کی نذر ہوجائے گی۔

احکامِ قرآنی پر عمل اتباعِ سُنّت کے بغیر ناممکن ہے

اگر احکامِ قرآنی میں تھوڑا سا غور کیا جائے تو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کو
کماحقہٗ سمجھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت، عقل کی تیزی اور فکر کی
سبک پروازی کافی نہیں۔ انسان کو عربی زبان میں کتنی ہی مہارت ہو اور وہ کتنا
ہی عقلمند و مفکر کیوں نہ ہو وہ قرآن سمجھنے میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی
رہنمائی کا محتاج ہے۔

آئیے مثال کے طور پر چند احکاماتِ قرآنی پر غور کریں!

چند مثالیں

سب سے پہلے قرآن کے اس فرمان کو لیجئے جس کے متعلق قرآن کی صدہا
آیات میں تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یعنی نماز کو قائم کرو۔

نماز کی یہ موجودہ صورت جس کی تعلیم نبی اکرمؐ نے دی ہے اس سے
خالی الذہن ہوکر سوچئے۔ آپ یقیناً اس کا معنی سمجھنے کے لئے کسی عربی لغت کی
طرف رجوع کریں گے۔

صلوٰۃ کے لغوی معنی

اس کے لغوی معنی کے متعلق جو تفصیل ملے گی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) صلی اللحم اذا شواہ او القاہ فی النار للاحراق

وقال الشاعر

الا یا اسلمی یا ھند ھند بنی بدر   تحیة من صلی فؤادك بالجمر [1]

یعنی جس وقت گوشت کو بھونا جائے یا جلانے کے لئے آگ میں ڈالا جائے
تو کہتے ہیں صلی اللحم، جیسے ایک شاعر نے (طنزاً) کہا:

اے قبیلہ بنی بدر کی ہند اُس شخص کا سلام قبول کر جس نے تیرے
دل کو انگاروں سے جلایا ہے۔

(۲) الصلوٰة من الصلوین لعرقین فی الظھر [2]

صلوٰة، صلوین کا مفرد ہے اور یہ ان دو رگوں کو کہتے ہیں جو پیٹھ
میں ہوتی ہیں۔

(۳) قال کثیر من اھل اللغة ھی الدعا یقال صلیت له ای
دعوت له وفی القراٰن اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ [3]

یعنی اکثر اہل لغت کی یہ رائے ہے کہ اس کا معنی دُعا ہے کہا جاتا ہے کہ
صلیت له میں نے اس کے لئے دُعا کی اور قرآن کریم میں ہے۔ اے محبوب!
تیری دُعا ان کے لئے باعثِ تسکین وطمانیت ہے۔

یہ تو اس لفظ کے لغوی معانی ہیں لیکن اب اس کا استعمال دوسرے معنوں
میں مجازاً ہوتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے۔

صلوٰة کا شرعی مفہوم

الصلوٰة عبادة فیھا رکوع وسجود وھذہ حقیقة
شرعیة لا دلالة لکلام العرب علیھا الا من حیث

۱، ۲، ۳ مفردات راغب۔

اشتمالھا علی الدعاء الذی ھو اصل معناھا [1]

یعنی صلاة اس عبادت کو کہتے ہیں جس میں رکوع اور سجود ہوتا ہے اور اس
لفظ کا یہ معنی حقیقت شرعیہ ہے اور کلام عرب اس معنی پر بالکل دلالت نہیں کرتی
مگر ایک حیثیت سے وہ یہ کہ صلوٰة کا اصلی معنی دعا ہے اور اس عبادت میں (اور
چیزوں کے علاوہ) دعا بھی کی جاتی ہے۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہوگیا کہ قرآن کریم کے احکام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے
صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں بلکہ سنتِ نبوی کی اتباع کے بغیر کام نہیں
چلتا۔ اب جو لوگ سنّت نبوی کو ضروری نہیں سمجھتے اور خود اپنی عقل و فکر سے
قرآنِ کریم کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیا وہ آگ میں کچھ بھون کر
یا جلا کر اس حکم کی تعمیل کریں گے یا صرف یہ دُعا کرکے (کہ یا رب ہماری تنخواہ
میں اضافہ کر) اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجائیں گے اس سے تو ان کو
بھی انکار ہے [2]۔

پھر اس فرض کو کس طرح ادا کیا جائے؟ لامحالہ سنّت نبوی کی طرف
رجوع کرنا پڑے گا۔

اس جملہ معترضہ کو جانے دیجئے، مجھے یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت
حکم دیا کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ تو اس کے اپنے علم میں تو ضرور اس کا مدلول اور مصداق
متعین ہوگا۔ اب وہی اقامت صلوٰة شرفِ قبولیت سے سرفراز ہوگی جو علمِ الٰہی کے
مطابق ادا ہو۔ اب اس پر آگاہی کیسے ہو۔ عقل انسانی تو آج سنِ شعور و شباب کا

۱ تاج العروس۔

۲ سر دست تو انکار فرماتے ہیں، کل دیکھئے کیا کہتے ہیں ؎
یہ ڈراما دکھاتا ہے کیا سین؟   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

یقینی اور کما حقہ، آگاہی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کے جاننے کا یہی ایک
طریقہ ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ اپنے نبی کو مطلع کر دے کہ میرے اس حکم کا
یہ منشا ہے اور اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ کے فرمان سے میں تمہاری بندگی اور عبودیت کا ثبوت
اس صورت میں چاہتا ہوں اور یہی حکمت ہے یعنی وضع الاشیاء علیٰ محلھا۔ اشیاء
کو اپنے حقیقی محل پر رکھنا۔

دوسری مثال

اسی طرح قرآن کریم نے مختلف مقامات پر حج کے ارکان اور وظائف کا
ذکر کیا ہے مثلاً وقت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ حج کے
مہینے مقرر ہیں۔ یعنی شوال، ذیقعد، دس روز ذوالحجہ کے۔ اس میں ذوالحجہ کی تخصیص
نہیں بلکہ سب برابر ہیں۔ اگر آپ ایام حج کے علاوہ مناسکِ حج ادا کریں تو تعمیل
حکم ہو جانی چاہئے۔ پھر فرمایا اِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ یعنی جب تم عرفات
سے واپس لوٹو۔ یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کس تاریخ کو وہاں جانا ہے، وہاں کیا کرنا ہے،
کتنا ٹھہرنا ہے اور کب لوٹنا ہے وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ چاہئے کہ اس
پرانے گھر کا طواف کریں۔ طواف کا لغوی معنی تو پھرنا ہے تو کیا اگر بیت اللہ شریف
کا ایک چکر لگا دیا تو تعمیلِ حکم ہو گئی۔ کتنے چکر کاٹنے ہیں، کہاں سے ابتدا کرنی
ہے اور کہاں پر اختتام، اثناء طواف میں کیا کرنا ہے اُن چیزوں کا ذکر نہیں۔ اسی
طرح احرام کا حکم دیا۔ لیکن اس کی صورت کیا ہے۔ کہاں سے باندھا جائے گا
کب ختم ہوگا۔ ان کی تصریح نہیں۔ ارشاد ہے وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جسے
اس کی استطاعت ہو۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس پر بشرطِ استطاعت
ہر سال حج فرض ہے یا عمر میں ایک دفعہ۔ اگر آپ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے

ارشادات کو واجب التسلیم نہ سمجھیں تو یہ فریضہ جس کی ایک بہت بڑی حکمت تمام
دنیائے اسلام میں مرکزیت اور احساس اتحاد و یگانگت پیدا کرنا ہے تشتت و
افتراق کی نذر ہو جائے گا۔

اس سے کسی کوتاہ اندیش کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نعوذ باللہ قرآن ایک نامکمل
کتاب ہے اور جو حکم دیتا ہے اس میں سراسر ابہام ہے اور کسی شخص کے لئے اس
کی نصوص کو دیکھ کر اس پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ بخدا ایسا نہیں اس کا تو ہر جملہ بلکہ ہر لفظ
مکمل ہے۔ ان میں کسی قسم کا خفا نہیں ہاں! اگر اس کے سمجھنے میں دقت ہے اور کوئی حکم
صریح طور پر ہم سمجھ نہیں سکتے تو یہ ہماری کوتاہی فہم کا نتیجہ ہے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے
تو اللہ تعالیٰ نے رسول مبعوث فرمایا۔ اگر تمہیں طواف کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تو تمہیں
بتائے بلکہ کر کے دکھائے کہ طواف کا یہ مفہوم ہے اگر احرام کی حقیقت تک تمہاری رسائی
نہیں تو وہ تمہیں بتائے گا کہ احرام سے مقصودِ خداوندی یہ ہے۔ اگر شہر حج کے متعلق تم
کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو اُس کا عمل اس کا ازالہ کر دے گا۔ اگر تم پریشان ہو کہ
کب میدانِ عرفات میں حاضر ہونا ہے وہاں کیا کرنا ہے، وہاں سے کب واپسی
ہوگی، تو آؤ اپنے نبی پاک کے افعال کو دیکھو جسے خداوندِ قدوس نے تمہاری طرف
اپنی کتاب سکھانے اور اس کی حکمتیں بیان کرنے کے لئے بھیجا ہے یہ عقدہ بھی خدا
کا رسول حل کر دے گا کہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ الخ سے منشاء ایزدی عمر میں ایک دفعہ
حج کرنا ہے یا بشرطِ استطاعت ہر سال۔ یہی حکمت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
نازل شدہ ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ اور نبی کتاب کے ساتھ حکمت
سکھانے پر بھی مامور ہوتا ہے۔ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔

عبادات اور معاملات کی تفریق

منکرینِ سنت یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبادات ہیں اور عملِ متواتر سے ثابت

ہیں اور زمانہ کے بدلے ہوئے تقاضے ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہماری کلام تو معاملات میں ہے۔

اگر احکام شریعت میں عبادات اور معاملات کی تفریق تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کرلی جائے تو پھر بھی اُن کا یہ شبہ معقول نہیں۔ جس چیز سے وہ گریز کر رہے تھے اسی کا وہ اعتراف کر رہے ہیں۔ یعنی اُن کے نزدیک بھی وہ عبادت جو حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بالتواتر ثابت ہو جائے وہ حجت ہے تو گویا حضورؐ کی سنت حجت ہے اور اس کے اثبات کے لئے تواتر روایت یا تواتر عمل ضروری ہے حالانکہ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضورؐ کی سنّت (نعوذ باللہ) حجت ہی نہیں خواہ وہ تواتر سے ہی ثابت ہو اگر تواتر عمل یا تواتر روایت سے وہ بھی سنت کو واجب التسلیم جانتے ہیں تو پھر عبادات کی تخصیص کہاں سے آگئی جو چیز تواتر سے ثابت ہو خواہ عبادات ہوں یا معاملات وہ اُمت کے لئے حجت ہونی چاہئے۔

عبادات و معاملات میں ان کی اس تفریق کی وجہ

نماز وغیرہ کے مسائل کے متعلق اُن کی آراء کا تضاد اور ان کا تذبذب قابلِ دید ہے۔ شجرِ ملّت کی شاخوں کو عُریاں اور بے برگ و ثمر دیکھنے کے جنون میں جب وہ اُسے زور زور سے جھنجھوڑتے ہیں اور ایک دو زرد زرد پتے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں تو خوشی سے اچھل پڑتے ہیں اور کامیابی کی منزل انہیں قریب تر دکھائی دینے لگتی ہے تو جوش سے کہہ اٹھتے ہیں کہ مسلمانوں کا امیر نماز کی موجودہ شکل ہیں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کرسکتا ہے اور جب ہوش آتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ لوگ تو رازِ درونِ محفل کو قبل از وقت فاش کر دینے سے چونک سے گئے ہیں اور اس دامِ ہمرنگِ زمیں سے دور ہو رہے ہیں تو پھر کہتے ہیں

ہم عبادات کے متعلق کچھ نہیں کہتے ہم تو صرف معاملات سے بحث کر رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے وہ عبادات و معاملات کی اس تفریق کا سہارا کیوں لیتے ہیں! اس لئے نہیں کہ ان دو چیزوں کے قرآنی احکام میں کچھ فرق ہے وہاں تو اس تفریق کا تصور بھی نہیں۔ وہاں تو صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل۔ نماز بھی اس لئے پڑھی جاتی ہے کہ اس کا حکم ہے اور کسب رزق کے لئے تگ و دو بھی اسی لئے کی جاتی ہے کہ اس کا حکم ہے، جھوٹ بھی اس لئے نہیں بولا جاتا کہ اس نے منع کیا ہے اور سود بھی اس لئے نہیں کھایا جاتا کہ اُس نے منع کیا ہے۔

لیکن جب ہم نے اسلام کا دامن چھوڑا اور اس جرم کی پاداش میں ہم پر انگریزی غلامی مسلط کر دی گئی تو انگریز نے سب سے پہلے عبادات و معاملات کے تشریعی اور قانونی تفاوت کا نظریہ پیش کیا۔ نماز روزہ کو عبادت کہا اور اس میں مسلمانوں کو آزادی دے دی اور اپنے عدل و انصاف اور رواداری اور فراخدلی کے قصیدے ساری دنیا کو سُنائے اور زندگی کی باقی ضروریات کو معاملات کہہ کر دین سے جدا کر دیا اور وہاں مسلمانوں کو اپنے قانون کا پابند بنا دیا۔

یہ صورت حال دو سو سال تک رہی۔ اس سے آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں جو اسلام کے نظام کامل سے ناآشنا ہیں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اسلام کی عبادات اور اسلام کے اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی نظام میں بہت فرق ہے، عبادات سے انکار یا ان میں تغیر و تبدل کرتے وقت وہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسلام کے دوسرے احکام کو پس پشت ڈالنے اور اُس کی جگہ دوسرے قوانین پر عمل کرنے میں وہ کچھ حرج محسوس نہیں کرتے۔

یہ حضرات قوم کی اس ذہنی کیفیت سے واقف ہیں جو غلامی کی اس طویل مدت کے دوران پیدا ہو گئی ہے اس لئے وہ پہلے معاملات کے اسلامی قوانین کو نسخ اور مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور اُن کا یہ خیال ہے کہ اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہو گئے تو عبادات

میں اپنے تصرفاتِ شاہانہ سے ردّ و بدل کرنا اُن کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

لیکن ان حضرات کو یہ ابھی سے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے اس نظام کو وہ ہرگز نہیں مٹا سکتے کیونکہ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ (ابراھیم ۲۴-۲۵)

ترجمہ: کیا تو نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے کیسے مثال ذکر فرمائی کہ پاکیزہ کلمہ (شریعتِ اسلامیہ) اس پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور شاخیں آسمان میں ہیں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ یاد رکھیں۔

اگر ان حضرات کی آراء کے تضاد اور افکار کے اختلاف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور ان کی یہ بات صحیح تسلیم کر لی جائے کہ وہ اپنے رسول کے صرف ان ارشادات کو حجت نہیں تسلیم کرتے جن کا تعلق معاملات سے ہے کیونکہ یہ ارشادات آج ساڑھے تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد اپنی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ اب ان سے زیادہ چمٹے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کاروانِ ترقی کی تیز روی کا ساتھ نہیں دے سکیں گے اور اس مقابلہ میں مات کھا جائیں گے جو اقوام عالم کے درمیان اپنی اپنی بقا اور فلاح کے لئے نہایت شدت سے ہو رہا ہے۔ تو بھی حقائق اور تجربات کی روشنی میں ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ خدشہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ بلکہ ان کے احساس مرعوبیت کی تخلیق ہے۔

شرحِ زکوٰۃ پر ان کا اعتراض اور اس کا جواب

سب سے زیادہ اعتراض ان کو شرحِ زکوٰۃ پر ہے۔ ان کو اس اندیشہ نے

ڈبلا کر رکھا ہے کہ اگر شرحِ زکوٰۃ اب بھی اڑھائی فی صدی ہو تو حکومت کا نظم و نسق نہیں چل سکتا۔ موجودہ زمانے میں اپنی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ہماری فوج لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل ہو اور جدید ترین اسلحہ سے مسلح ہو۔ تعلیم، صحتِ عامہ، ذرائع رسل و رسائل، زرعی اصلاحات کی تجاویز، صنعتی ترقی کے لئے منصوبہ بندی اور دیگر امور کے لئے اربوں روپیہ کی ضرورت ہے اور یہ حکومت کی وہ ضروریات بلکہ فرائض ہیں جن سے ایک لمحہ کے لئے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ پھر ان موجودہ حالات میں اڑھائی فی صدی کی شرحِ زکوٰۃ ان اخراجات کی کیسے کفیل ہو سکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکومتِ وقت کو اختیار ہو کہ وہ اپنی ضروریات کے پیشِ نظر اس شرح کو گھٹا بڑھا سکے۔

اسے بنیادی تصوّر کرتے ہوئے وہ یہ کلیہ مستنبط کرتے ہیں کہ خلافت کا قیام اقامتِ دین کے لئے فرض عین ہے اور زکوٰۃ کی شرح بڑھائے بغیر اسلامی خلافت کا قیام محال ہے اس لئے جو چیز فرض کی ادائیگی میں مزاحم ہو وہ واجب الترک ہے اور جب شرحِ زکوٰۃ واجبُ الترک ہے جو حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مقرر فرمائی تو ہر وہ چیز جسے حضورؐ نے متعین فرمایا مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر ترک کی جا سکتی ہے اس لئے ثابت ہوا کہ اُمت پر حضورؐ کا فرمان حجت نہیں۔

ان حضرات نے حکومت کی ذمّہ داریوں اور اس کے اخراجات کا جو اندازہ لگایا ہے وہ حرف بحرف دُرست ہے لیکن زکوٰۃ کا مفہوم سمجھنے میں اُن کی عقل نے دھوکہ کھایا ہے وہ زکوٰۃ کو ٹیکس کا مترادف سمجھ رہے ہیں اور اسی پر انہوں نے اپنا قصرِ استدلال تعمیر کیا ہے لیکن ے

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ‏ ‏ تا ثریا می رود دیوار کج

یہی اُن کی بنیادی غلطی ہے جس نے اُن کو گوناگوں اُلجھنوں میں گرفتار کر دیا ہے

ٹیکس کا مفہوم الگ ہے اور زکوٰۃ کا مفہوم الگ۔ اس لئے ان کے مصرف میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے ٹیکس کہتے ہیں اُس معاوضہ کو جو انسان حکومتِ وقت کو بحالی امن، حفاظتِ جان و مال اور اندرونی اور بیرونی جنگوں کی روک تھام کے لئے ادا کرتا ہے جیسے معاشیاتِ جدید کی کتابوں میں صراحۃً مذکور ہے:-

The Stat grants protection, in return for which it is entitled to a share in the incom of the People which is called tax.

اس لئے حکومت اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہے اسے خرچ کرنے کی مجاز ہے۔

زکوٰۃ کا اسلامی مفہوم

لیکن زکوٰۃ کا اسلامی مفہوم اس سے بہت مختلف ہے۔ اس سے غرض تو یہ ہے کہ ملّت کے ان افراد کی قانونی طور پر کفالت کر دی جائے جو پیدائشی طور پر کسبِ معاش سے قاصر ہیں یا کسی بیماری اور حادثے نے انہیں معذور کر دیا ہے یا تجارتی ناموافق حالات کے باعث ان کا سرمایہ برباد ہو چکا ہے اور ان کی ذہنی قابلیتیں اور قیمتی کاروباری تجارب قرضے کی آہنی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے معطل ہو چکے ہیں۔ یا موت کے بے رحم ہاتھوں سے کسی کا سہاگ لٹ چکا ہے اور اب وہ بے بس ہے۔ یا ملّت کے وہ افراد جن کا سارا وقت ملّت کی کسی خاص خدمت میں گزر جاتا ہے

اور یہ زکوٰۃ ہر مالکِ نصاب مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر انفرادی طور پر فرض ہے۔

اب اگر حکومتِ اسلامیہ قائم ہے تو اسلام اس پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ تمام ذی استطاعت لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے اگر وہ بطیبِ خاطر دینے کے لئے تیار نہ ہوں تو بہ جبر وصول کرے اُسے حکم ہے:-

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً - لو اُن کے مالوں سے صدقہ (زکوٰۃ)

اور زکوٰۃ سے وصول شدہ روپیہ کو حاجتمندوں کی حاجت روائی میں نہایت نظام اور سلیقہ سے خرچ کرے تاکہ وہ خوش نصیب خطۂ زمین جس پر اسلام کا مبارک پرچم سایہ فگن ہے۔ اس میں کوئی یتیم اور کوئی بیوہ بے آسرا نہ رہے۔ کوئی انسان فاقہ کش اور حاجت مند نہ ہو۔ تاکہ یہ اُمت اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہو جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا بنی ہوئی ہوتی ہے کانھم بنیان مرصوص یشد بعضہ بعضا۔ اور غریب و امیر اور مزدور اور سرمایہ دار کی طبقاتی کشمکش کی آگ سے اس کا دامن محفوظ رہے تاکہ ہر تاجر اور کارخانہ دار اپنے مستقبل کو بیمہ شدہ Insured محسوس کرتے ہوئے ملک کی معاشی اور صنعتی ترقی میں پورا حصہ لے سکے اور صنعتی اور اقتصادی بحرانوں کا خطرہ اسے حفظِ ماتقدم کے طور پر ناجائز نفع لینے پر مجبور نہ کرے اور اپنے مستقبل سے مطمئن ہو کر وہ اپنی صنعت کو بہتر سے بہتر بنانے میں اپنی تمام تر توجہ صرف کر سکے۔

کاش! ایسی اسلامی حکومت ہمیشہ اور ہر جگہ قائم رہتی! افسوس! کہ ایسا نہیں! اب جب کہ یہ حقیقت ہے۔ کتنی تلخ ہی سہی! اور واقع ہے۔ کتنا اندوہناک ہی سہی! کہ مسلمان ممالک غیر مسلم حکمرانوں کے قبضے میں چلے گئے۔ یا مسلمانوں میں سے ہی بے دین طبقہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ یا چند مسلمان کسی مصلحت سے کسی غیر اسلامی ملک میں اقامت گزیں ہو گئے اور ایسی حکومتیں ٹیکس وصول کرتی ہیں اور ان حاجتمندوں کی ضروریات کی طرف توجہ نہیں کرتیں تو کیا ان حالات میں مسلمان ذی استطاعت لوگ ٹیکس ادا کر کے یہ سمجھ لیں کہ ہم زکوٰۃ کے فریضہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ان یتیم بچوں، ان حسرت نصیب بیواؤں، ان شکستہ خاطر بیماروں یا ان ستم رسیدہ اور برباد شدہ لوگوں کی اعانت ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض نہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا یہ اسلام کی پاکیزہ

تعلیمات کے موافق ہے؟ کیا یہ اس بات کا اعتراف نہیں کہ شریعتِ اسلامیہ ان ناموافق حالات میں ان ضرورتمندوں کی دستگیری کرنے سے قاصر ہے؟

ہرگز نہیں۔ اسلام اس وقت ہر مسلمان مرد اور عورت سے مطالبہ کرتا ہے بلکہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے مال سے اس ٹیکس کے علاوہ زکوٰۃ نکال کر اپنے ضرورت مند بھائیوں اور بہنوں پر خرچ کرے۔

ذرا غور کیجئے ہندوستان کا مسلمان جس نے اس لئے ہندو کی غلامی کی بیڑیاں خوشی سے پہنی تھیں کہ کہیں ایک ایسی سلطنت معرض وجود میں آجائے جہاں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق عمل ہو۔ اب اگر ان حضرات کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ زکوٰۃ ٹیکس کے علاوہ کچھ نہیں تو وہاں کے سارے مسلمان تو دولت مند نہیں۔ ان میں بیمار بھی ہیں، اپاہج بھی، یتیم بھی ہیں اور بیوائیں بھی۔ ان کی حفاظت اور دستگیری اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہاں کے ذی استطاعت مسلمانوں پر واجب نہ ہو تو کون ان کی مدد کو آئے گا؟ کیا حکومت ہند جس کا دامن بے گناہ مسلمانوں کے خون سے لت پت ہے؟ کیا برلا اور ٹاٹا جن کی تجوریوں کے منہ ان غنڈوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو مسلمانوں کو ہراساں کر کے ان کے وسائل معاش کو زبردستی ان سے چھین رہے ہیں؟ کیا ہندو مہاسبھا کے مکرجی آپ کے یتیم بچوں کی آنکھوں سے نہ تھمنے والے آنسو خشک کریں گے؟

کیونکہ زکوٰۃ سے مقصد ہر حالت میں اور ہر وقت میں اُمت اسلامیہ کے ضرورتمند طبقہ کی قانونی طور پر کفالت کرنا ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی شرح اڑھائی فی صدی مقرر فرما دی اور زکوٰۃ کو ٹیکس کا مترادف قرار دے کر اسلام کے نظام اقتصادیات کی اس جلیل القدر بنیاد کو منہدم کرنا ہے جس پر یہ قصرِ رفیع قائم ہے اور یہ نظامِ زکوٰۃ اسلام کا وہ طرۂ امتیاز ہے جو اس کی صداقت اور من اللہ ہونے پر

شاہد عادل ہے۔ آپ غور کریں اگر ٹیکس اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں اور دونوں ایک ہی چیز ہیں تو اس میں اسلام کی کون سی خصوصیت ہے۔ دُنیا کی تمام حکومتیں اپنی ضروریات کے مطابق ٹیکس لگاتی ہیں اور وصول کرتی ہیں۔

یہ حضرات کسی اسلامی اصول کی گہرائی میں اُترنے کی زحمت تو برداشت کرتے نہیں اور ایک سطحی نظر ڈال کر اس پر اپنا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں یہ ان کا قصور ہے یا اسلام کا؟

تیری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ　　　تیرا گناہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

زکوٰۃ کی اس غرض وغایت کو ہادیٔ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان مبارک الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذاً رضی اللہ عنہ الی الیمن فقال: ادعھم الی شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ فان اطاعوك فاعلمھم ان اللہ قد افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم و لیلۃ فان ھم اطاعوا لذلك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔ (صحیح البخاری۔ باب وجوب الزکوٰۃ)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو فرمایا کہ پہلے انہیں دعوت دینا کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی خدا نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں، تو انہیں یہ سکھانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پانچ نمازیں ہر دن رات میں فرض کی ہیں اور اگر وہ یہ بھی تسلیم کر لیں تو پھر انہیں یہ سکھانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے دولت مندوں سے لیا

جائے گا اور ان کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا۔

کیونکہ زکوٰۃ کا مقصد امت کے اس ضرورت مند طبقہ کی قانونی طور پر کفالت کرنا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کی آمدنی کے خرچ کرنے کی جگہوں کو خود متعین فرما دیا۔ ارشاد ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ: زکوٰۃ وصدقات حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا مقصود ہو اور گردنوں کے چھڑانے کے لئے (یعنی قیدیوں اور غلاموں کی دستگیری کے لئے) اور اُن کے لئے جو تاوان کے بوجھ سے دبے ہوتے ہیں (یعنی قرض دار اور ضامن) اور اللہ کے راستہ میں (جان سے لڑنے والوں کے لئے) اور مسافروں کے لئے یہ مقرر ہے خدا کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

واقعی اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ اگر اس نے یہ مصرف اپنے کلام مجید میں ذکر نہ کر دیئے ہوتے تو ان حضرات کے لئے میدان صاف تھا پہلے شرح زکوٰۃ پر برستے پھر مصارفِ زکوٰۃ پر ہاتھ صاف کرتے اور اس طرح عمل بالقرآن کے دعویٰ کی آڑ لے کر ایوانِ شریعت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ لیکن اس علم والے اور حکمت والے خدا نے کتاب وحکمت کا ایسا حسین امتزاج کیا ہے کہ نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔ حکمت کو شارح کتاب بنایا اور کتاب کو محافظِ حکمت۔ اور کسی مدعی اسلام کے لئے ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر عمل کرنا ناممکن بنا دیا۔ تارکِ سنت کو ترکِ قرآن کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور عامل بالقرآن کو عمل بالسنت کے بغیر بن ہی نہیں پڑتی

سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ۔

زکوٰۃ کے مال سے وزراء کی کوٹھیوں کو فرنیچر سے مزین نہیں کیا جا سکتا۔ بڑے بڑے افسروں کی تنخواہوں اور بھتوں میں خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی یہ مال سیر وسیاحت اور ڈنروں اور ٹی پارٹیوں میں اڑایا جا سکتا ہے اور تو اور اس مال سے ایک پائی مسجدوں کی تعمیر ومرمت کے لئے خرچ کرنا بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی رُو سے زکوٰۃ کا مصرف تو صرف یہ آٹھ گروہ ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر اڑھائی فی صدی کے حساب سے باقاعدہ زکوٰۃ وصول کی جائے تو ان ضروریات کے لئے کیا کافی نہیں ہو سکتی؟

میں ان حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر حکومت زکوٰۃ کو وصول کر کے اسے پانچ سال تک غربت، جہالت اور مقروضیت وبیماری وغیرہ سے جنگ کرنے میں خرچ کرے تو آپ کو پاکستان بھر میں کوئی بھوکا، کوئی جاہل، کوئی مقروض اور کوئی بے سہارا آدمی نظر نہ آئے۔ جو چیز آگ کے طوفان اور خون کے دریا بہانے کے بعد اشتراکیت حاصل نہیں کر سکی وہ آپ نہایت امن سے کسی کی حاصل کردہ دولت کو غصب کئے بغیر اور کسی کو اس کے جائز حق سے محروم کئے بغیر حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن یہاں مقصود اصلاح تو ہے نہیں تاکہ ان امور کی طرف توجہ دی جائے جو کرنے کے ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان واضح عقائد میں تزلزل پیدا کیا جائے جو اللہ کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے دلوں میں جگہ پکڑ چکے ہیں۔ اور ایسے حیلے تراشے جائیں جن کے رُو سے دولت کے پجاریوں کو زکوٰۃ کے بارِ گراں سے نجات دلائی جا سکے۔ اور ان کے دل ودماغ پر اپنے اجتہاد اور علم کا سکہ جمایا جا سکے۔ باقی رہی قوم، اس کے یتیم بچّے اور اس کی حرماں نصیب بیٹیاں! تو ان سے انہیں کیا واسطہ؟ صاحب کی کرسی سلامت رہے اور یکم تاریخ کو تنخواہ جیب گرم

ہو جائے تو سب خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ "رُخ ہمچوں ماہِ تاباں دل ہمچوں سنگِ خارا"
کی قماش کے مصلحین سے اس امت کو محفوظ رکھے ؎

خدا ایں سخت جاں را یار بادا — کہ افتادست از بام بلندے

وہ حضرات (منکرینِ سنتِ نبوی) فرماتے ہیں کہ قوم زکوٰۃ بھی دے اور ٹیکس
بھی۔ اتنا بوجھ قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اور دوسری طرف حکومت کو کھلی
چھٹی دیتے ہیں کہ وہ قوم کی آمدنی سے جتنے فی صد (بیس یا پچاس فی صد یا اس سے
بھی زائد) چاہے ٹیکس وصول کر سکتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر حکومت پچاس
فی صد ٹیکس وصول کرلے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر اسی پچاس فی صد میں سے
اڑھائی فی صد زکوٰۃ کے نام سے لے اور اسے صرف ان مصارف میں خرچ کرے جو
قرآن کریم نے خود ہی متعین فرما دیئے ہیں۔ اور باقی ساڑھے سینتالیس فی صد ٹیکس
کے نام سے وصول کرلے تو قوم کی کمر صرف دوہری ہی نہیں بلکہ ٹوٹ کر چکنا چور
ہو جائے گی۔ کوئی ان عقل و دانش کے اجارہ داروں سے پوچھے کہ زکوٰۃ میں
کون سا ثقل پنہاں ہے جس سے حکومت کا ہلکا پھلکا پچاس فی صدی ٹیکس
ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

مُلّا اور زکوٰۃ

ان لوگوں کو شاید یہ فکر ہلکان کئے ہوئے ہے کہ زکوٰۃ کی رقم مولوی یا مُلّا
(یا جس لفظ سے وہ داعیانِ حق کو مخاطب فرمائیں) کی جیب میں چلی جائے گی۔
وہ یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول کے دین کے پرچم کو بلند رکھنے
کا عزم کرنے والے اس سے ایک پائی بھی نہیں لیں گے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں
کہ حکومت زکوٰۃ خود لے کر ضرورتمندوں میں اپنی نگرانی میں خرچ کرے۔
مُلّا تو نذیرِ عریاں صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث ہے وہ تو تمہیں بروقت مطلع کر

رہا ہے کہ میں نے بے سہارا یتیموں کی دھنسی ہوئی آنکھوں کے پردوں میں وہ آنسوؤں
کے قطرے دیکھے ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمیں اور یونہی ستایا گیا تو ؏

بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

مُلّا تمہیں بتا رہا ہے کہ میں نے ان مریل لاشوں کو جو تم نے مُردہ سمجھ کر اپنے
شبستانوں سے دور پھینکوا دی تھیں۔ میں نے ان میں بغاوت کا خون گردش کرتے
دیکھا ہے۔ ان میں پھر حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ وہ صبر کا کفن جس میں تم نے انہیں
لپیٹا تھا وہ اب تار تار ہونے والا ہے۔ ان کی معنی خیز خاموشی کہہ رہی ہے ؎

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دل
مدت ہوئی ہے چاک گریباں کئے ہوئے

مُلّا تمہیں بتا رہا ہے کہ میں نے اپنے پڑوس میں تمہارے راحت کدوں سے
دور، بہت دور، بے آسرا بیواؤں کے گلو شکستہ نالوں کو زلزلہ بنتے دیکھا ہے۔ اور
اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بہت سو لئے اب تو جاگو! بہت دادِ عیش
دی۔ اب تو ہوش میں آؤ۔ ساری شب عمر تو ہنگامہ گستری میں کٹی اب تو سپیدۂ
سحر طلوع ہو رہا ہے۔ اب تو اللہ کا نام لو۔

ورنہ! ورنہ سیلاب آئے گا خون کا سیلاب جس میں تم اور تمہارا متاعِ
عیش و عشرت تنکوں کی طرح بہ جائے گا۔ ورنہ قیامت آئے گی سُرخ قیامت
جو تمہاری لذات و شہوات کی دنیا کو درہم برہم کر دے گی اور تم یہ کہتے ہو مُلّا ہے
مُلّا۔ بک رہا ہے۔ اسے بکنے دو۔ چپ نہیں کرتا تو اس کا منہ سی دو۔ اس کی
زبان کاٹ دو۔ یہ بھوکا مُلّا ہم سے خیرات مانگتا ہے۔ یہ نکما مُلّا ہماری دولت
میں شریک بننا چاہتا ہے۔

لیکن خدا شاہد ہے کہ مُلّا سچ کہہ رہا ہے۔ اگر آج نہ مانو گے تو کل ضرور ماننا

پڑے گا لیکن اس سے کیا حاصل؟ مکافاتِ عمل کا فرشتہ اس وقت ہر معذرت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دے گا:

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ

اب پچھتانے سے کیا حاصل! آج تک تو سرکشی کرتے رہے۔

یہ حضرات اگر علماء اسلام کے زرّیں کارناموں کو پڑھتے اور ان کی جلیل القدر تصانیف کا مطالعہ کرتے تو انہیں ان کی عظمت، ان کی بالغ النظری ان کی قرآن فہمی کا اندازہ ہوتا۔ انہیں پتہ چلتا کہ جب دنیا جہالت و وحشت کی تیرگیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب عدالتِ اجتماعیہ کا کہیں تصوّر تک بھی نہ تھا۔ جب حریت و مساوات کی کہیں کرن تک نہیں پھوٹی تھی۔ تو اس وقت فقط ان علماء کے ہاتھ میں ہی رشد و ہدایت اور علم و نور کی مشعل تھی۔ انہیں میں سے ایک مُلّا کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں جو اس نے فرائضِ امیر کے متعلق لکھی ہے۔

شرعۃ الاسلام کے مصنف سید علی زادہ حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں۔

ولا یدع فقیرا فی ولایته الا اعطاه ولا مدیونا الا قضی عنه دینه ولا ضعیفا الا اعانه ولا مظلوما الا نصره ولا ظالما الا منعه عن الظلم ولا عاریا الا کساه کسوة۔[1]

یعنی:۔ امیر المؤمنین پر فرض ہے کہ وہ اپنی مملکت میں کسی فقیر کو فقیر نہ رہنے دے۔ اور کسی قرض دار کو قرض دار باقی نہ رکھے اور نہ کسی کمزور کو بے یار و مددگار رہنے دے اور نہ کسی مظلوم کو داد رسی سے محروم رکھے اور نہ کسی ظالم کو ظلم کرنے دے اور ہر ننگے کو لباس مہیا کرے۔

[1] اسلام کا اقتصادی نظام ص ۱۲

اب پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف لوٹیں۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ زکوٰۃ کا مفہوم ٹیکس کے مفہوم کے مترادف نہیں جیسے ان حضرات کو غلط فہمی ہوئی۔ بلکہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور زکوٰۃ کو فرض کرنے کا مقصد حاجت مند طبقہ کی قانونی طور پر کفالت کرنا ہے۔ اور یہ ہر حالت میں ہر ذی استطاعت مسلمان پر فرض ہے اور اس کے خرچ کرنے کی جگہوں کو اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دیا ہے جن کے بغیر اس مد کی آمدنی سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی جا سکتی۔ تو اب یہ باور کرنے میں کوئی شبہ نہ رہا کہ زکوٰۃ کی جو شرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے وہ ہر حالت کے لئے ہے اور ہر زمانے کے لئے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت کتاب سے ثابت ہوئی تو اس کی شرح اور اس کے اسباب اور شرائط کو حکمت نے واضح کر دیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بعینہٖ اسی طرح تعمیل ہو جس طرح منشأ خداوندی ہے۔

اگر حکومتِ اسلامی دیگر ضروریات کے لئے مزید روپیہ کی ضرورت محسوس کرے تو اسے اختیار ہے کہ دولت مند طبقہ پر مزید ٹیکس لگائے اور اگر دولت مند طبقہ بخوشی ادا نہ کرے تو امیرِ وقت جبراً بھی ان سے وصول کر سکتا ہے۔

ایک اور مثال

ایک اور مثال سنئے قرآن کریم میں ہے کہ

يُحِلُّ اللّٰهُ لَكُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْكُمُ الْخَبٰٓئِثَ

حلال کیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں اور حرام کیں تم پر ناپاک چیزیں۔ سارے قرآن میں چار چیزیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مُردار[۱]، خون[۲]، خنزیر[۳] اور وہ[۴] جانور جسے غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ اس کے علاوہ اور سینکڑوں چیزیں حرام ہیں۔ مثلاً کوا، گدھ، گدھا، سانپ وغیرہ۔ ان کو حضور کریمؐ نے حرام فرمایا۔ کیا آپ ان کو حلال کر دیں گے۔ کتاب اللہ نے خبائث کو حرام کیا

اور حکمت نے ان خبائث کی تفصیل بیان کر دی۔ یہ غلط ہے کہ قرآن محتاج ہے احادیث کا۔ لیکن اس کی صحت میں ذرا شبہ کرنا انتہائی حماقت ہے کہ ہم قرآن سمجھنے میں احادیث نبوی کے محتاج ہیں۔ کیونکہ قرآنِ حکیم براہِ راست سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور حق جل شانہٗ نے اس کے تمام احکام کی تعبیر، اخبار و حکایات کا پس منظر، اجمال کی تفصیل، اشارات و کنایات کی تفسیر، اصطلاحات کی تشریح، آیاتِ بینات اور متشابہات کا مفہوم اور حروفِ مقطعات کا حل اپنے محبوب کریم کو واضح طور پر سمجھا دیا کیونکہ اگر قرآن کا کوئی گوشہ حضورؐ کے علم سے مخفی رکھا جاتا تو پھر اس کے نازل کرنے کا فائدہ ہی کیا؟ اس حقیقت کو سورۃ القیامہ میں نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (القیمۃ ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

ترجمہ:۔ تم یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ بیشک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم اسے پڑھ چکیں اس وقت اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو پھر بیشک اس کی باریکیوں کا تم پر ظاہر کرنا ہمارے ذمہ ہے۔

اس تفصیل سے مقصد تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ بجز ارشادِ رسالت مآب ہم قرآن کریم کے کسی حکم کی تعمیل اس طرح نہیں کر سکتے جیسے کہ منشاء خداوندی ہے۔

للہ در من قال

بکوئے عشق منہ بے دلیلِ راہ قدم — کہ من بخویش نمودم صد اہتمام نشد

اس لئے قرآن پر عمل کرنے والے کے لئے اتباعِ سنت کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

میری اس گزارش پر کہ حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تب درست ہے جب حکمت خاصۂ نبوت ہو، اور کوئی غیرنبی حکمت کا حامل نہ ہو۔ حالانکہ نصوصِ قرآنی میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ حکمت انبیاء کے علاوہ غیر انبیاء کو بھی عطا کی جاتی ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ (البقرۃ ۲۶۹)

ترجمہ:۔ دیتا ہے حکمت جسے چاہتا ہے اور جسے حکمت دی جائے اُسے تو خیر کثیر عطا کی گئی۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی آیات اس مضمون کی تائید کرتی ہیں۔

جواباً التماس ہے کہ میں نے اس حکمتِ خاص کا معنی سنت کیا ہے جو کتاب کے ساتھ مذکور ہوتی ہے اور یہ حکمت غیر انبیاء کی حکمت سے بالکل ایک جدا چیز ہے۔ ان دو حکمتوں کا بین فرق تو یہ ہے کہ نبی کی حکمت منزل من اللہ ہوتی ہے جیسے آیاتِ کثیرہ سے ظاہر ہے اور غیر انبیاء کی حکمت سے مراد وہ ملکہ ہے جس کی وجہ سے نظر و فکر کرنے سے حقائق اشیاء پر آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اول الذکر میں غلطی ممتنع اور آخر الذکر میں غلطی کا وقوع عین ممکن۔ اور اگر آپ اس فرق کو تسلیم نہ کریں اور حکمتِ انبیاء سے مراد بھی وہ ملکہ ہو جس کی وجہ سے نظر و فکر کرنے سے حقائق اشیاء پر آگاہی حاصل ہوتی ہے تو پھر عرض یہ ہے کہ یہ تصریح تو خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی کہ انبیاء کو حکمت عطا کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ تو فرمایا کہ ہم لوگوں کو حکمت سے نوازتے ہیں۔ لیکن یہ تصریح کہیں بھی نہیں کہ فلاں فلاں کو حکمت کا انعام دیا گیا۔ اب یہ کیسے پتہ چلے کہ فلاں شخص کو واقعی حکمت دی گئی ہے۔ اس لئے

وہ واقعی حکیم ہے اور اس کے نتائجِ فکر پر عمل پیرا ہونا موجبِ عز و فلاح ہے۔ یوں تو
دنیا میں بے شمار ایسے آدمی آپ کو ملیں گے جو قالاً یا حالاً مدعی حکمت ہیں۔ اگر فقط
کسی کے دعوائے حکمت سے کسی کی حکمت مسلم ہو جائے تو آپ کو ان فلاسفہ کو بھی
قرآنی اصطلاح میں حکیم ماننا پڑے گا۔ جو سرے سے وجودِ باری کے منکر ہیں جو فسق و
فجور اور بد اخلاقی کے داعی ہیں اور جن کے افکار و آراء کی برکت سے آج انسان
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر کا منظر پیش کر رہا ہے۔

کیا آپ ان کو بھی اس حکمت کا حامل سمجھتے ہیں۔ جسے قرآن نے خیرِ کثیر کہا ہے
اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ امتیاز کرنا ہوگا کہ وہ کون خوش نصیب ہے جسے خیرِ کثیر
انعام مرحمت ہوا۔ یہ جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کے نتیجۂ فکر کا موازنہ اس حکیم
سے کیا جائے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ صاحبِ حکمت ہے۔ جس مدعی حکمت
کی حکمت اس حکیم کے مطابق ہوئی اس کی حکمت مسلّم ورنہ مردود ہم صرف نبی کے متعلق
ہی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صاحبِ حکمت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بار بار انبیاء
پر حکمت نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ تو اب قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق وہی حکیم
اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا کے مژدۂ جانفزا کا مستحق ہوگا جس کی حکمت، حکمتِ نبوی سے
ہم آہنگ ہوگی۔ ورنہ وہ دشتِ ظن و تخمین کا بھٹکا ہوا مسافر ہے جو خود ابھی منزلِ
مقصود سے کوسوں دور ہے وہ کسی دوسرے کی رہنمائی کے قابل کب؟

اطاعتِ امیر

دوسروں کے متعلق تو منکرینِ سنت کو یہ شکایت ہے کہ ان لوگوں نے تاویلات
سے قرآنی روح مسخ کر دی ہے اور اس کے حقائق کی رعنائی اور دلآویزی کو اپنے افکار
کے دبیز پردوں میں چھپا دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں توڑ موڑ کرنا ایک گناہ کبیرہ ہے جس

کے لئے قیامت کے روز سخت محاسبہ ہوگا۔ لیکن تعجب اس پر ہے کہ جب ان کی اپنی
باری آتی ہے تو یہ حضرات وہ وہ تاویلیں کرتے ہیں جن سے آیاتِ قرآنی صراحۃً انکار کرتی
ہیں کیونکہ جب ان سے عرض کیا گیا کہ قرآن میں بار بار اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ
اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، کا حکم مذکور ہے اس لئے اطاعتِ
رسول سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ یہ آیات سن کر اپنی
غلطی کا اعتراف کرتے اور اس رائے کو بدل دیتے۔ انہوں نے اپنی رائے بدلنے میں
تو اپنے علمی وقار و تمکنت کی سبکی سمجھی اور نہایت بیباکی سے آیاتِ قرآنی کے معانی
میں تحریف کر دی۔ جھٹ کہہ دیا کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ سے خدا اور
رسول کی اطاعت مراد نہیں بلکہ حکومتِ وقت کی اطاعت ہے۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ان کے نزدیک تو آگ کا معنی ہوا اور سمندر کا معنی ریگستان ہے لیکن ہمارے فکرِ
نارسا کے لئے تو یہ نکات ناقابلِ فہم ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے جو ابھی تک آگ کا
معنی ہوا سمجھنے سے قاصر ہیں کاش! یہ حضرات ان لطائف کا اظہار نہ فرماتے۔ سچ
کہئے! کیا یہ قرآن کی تحریف نہیں؟ کیا یہ آیاتِ قرآنی کا مسخ نہیں؟ کیا یہ خدا کی
آخری کلام سے مذاق نہیں؟ یقیناً یہ تحریف ہے مسخ ہے مذاق ہے۔ اُن کو اس
سے باز آنا چاہئے۔

زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

آج تک نظامِ شرعی اور عقائدِ اسلامی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے لرزہ
خیز آندھیاں چلیں، اور ہوش رُبا طوفان اُمڈے۔ لیکن اپنی تمام بیباکیوں کے باوجود
اطاعتِ رسول کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی شومئ قسمت! یہ
سعادت ان لوگوں کے حصہ میں لکھی تھی۔ جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں اور عمل بالقرآن

کے مدعی ہیں کہ وہ اس اساس محکم کو پیوندِ خاک کرنے میں اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف کر دیں۔ جس کے سہارے امت مرحومہ نے ہر سیلِ حوادث کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور جس کی برکت سے اس کا وجود چنگیزی غارت گریوں اور صلیبی آگ اور موت اگلنے والی یورشوں کے باوجود آج تک رونقِ بزمِ ہستی بنا ہوا ہے۔

اگر اُن کا مفروضہ ایک لمحہ کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت حضور کی ظاہری مدت زیست تک فرض تھی تو قرآن نے کیوں ایک آیت میں اس کی تصریح نہ کر دی کہ حضورؐ کے انتقال فرمانے کے بعد تم پر اطاعت رسول فرض نہیں بلکہ اس وقت تم اپنے خلیفہ کو اپنا مطاع بنانا۔ اطاعتِ رسول پر تو اتنا زور دیا کہ سینکڑوں آیتیں اس سبق کو ذہن نشین کرانے کے لئے وقف کر دیں اور اس امر کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا کہ رسول کے بعد اطاعتِ رسول سے مراد اطاعتِ حاکمِ وقت ہے۔

اگر وہ ایک ہی ایسی آیت دکھا دیتے جس سے صراحۃً نہ سہی کنایۃً ہی یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داغ مفارقت دے جانے کے بعد امت حضورؐ کی اطاعت سے سبک دوش ہے تو کوئی بات بھی تھی لیکن اطاعتِ نبوی پر ان گنت شواہد وبراہین کی موجودگی میں ان کا ایک ایسی آیت بھی پیش نہ کر سکنا۔ اُن کے دعوے کے بطلان کے لئے کافی ہے۔

اگر قرآن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ھُدًی لِّلنَّاسِ یعنی وہ بنی نوع انسان کے لئے قیامت تک کے لئے پیغامِ ہدایت ہے اگر اس کا یہ اعلان مبنی برحقیقت ہے کہ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ کہ اس میں ظاہر اور کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ اگر یہ بھی درست ہے کہ اطاعتِ نبوی پر سینکڑوں آیتیں شاہد عادل ہیں۔ اور اگر وہ برسوں کی جگر کاوی اور دیدہ سوزی کے باوجود ایک ایسی آیت کی نشان دہی

ہی نہیں کر سکے جس میں حضورؐ کی اطاعت محدود ہو حضور کی حیاتِ ظاہری پر

تو پھر

کیا یہ حقیقت واشگاف نہیں ہو جاتی کہ وہ اس مسئلہ میں بُری طرح بھٹک گئے ہیں اور دانش مندی اور دیانتداری کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس طرزِ فکر سے علی الاعلان بیزاری کا اظہار کریں اور اگر وہ پھر بھی اسی پر مُصر ہوں تو ہمارے لئے یہ باور کرنے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب کچھ دانستہ طور پر کیا جارہا ہے اور کرایا جارہا ہے اور انکارِ سنت کا فتنہ ان فتنوں سے ایک ہے جس کے متعلق نہایت صفائی سے اس ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے اپنی امّت کو متنبہ فرما دیا تھا۔

عن المقدام بن معدی کرب قال: حرم النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اشیاء یوم خیبر، منها الحمار الاهلی وغیره فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: یوشك ان یقعد الرجل منکم علی اریکته یحدث بحدیثی فیقول بینی وبینکم کتاب اللّٰہ فما وجدنا فیه حلالا استحللناه وما وجدنا فیه حراما حرمناه۔ وان ما حرم رسول اللّٰہ کما حرم اللّٰہ۔

(وھٰذا حدیث صحیح رواه احمد فی مسنده من وجهین مختلفین ورواه الدارمی وابوداؤد والترمذی وابن ماجه)[1]

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدی کرب نے کہا کہ خیبر کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلی گدھے کو اور دوسری چیزوں کو حرام کیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا عنقریب تم میں سے ہی ایک آدمی اپنی مزیّن چارپائی پر بیٹھے گا اور جب

[1] ہامش الرسالۃ للامام الشافعی طبع احمد شاکر ص۹۱ الموافقات الشاطبی ص۱۵ ج ۴۔

اس کے سامنے میری حدیث پیش کی جائے گی تو کہے گا میرے اور تمہارے درمیان صرف قرآن ہے جس چیز کو ہم نے قرآن میں حلال پایا اسے حلال سمجھیں گے اور جس کو اس میں حرام پایا اسے حرام سمجھیں گے (پھر فرمایا) یقیناً جس چیز کو اللہ تعالیٰ کے رسول نے حرام کیا وہ اسی طرح حرام ہے جیسے اسے اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہو (کیونکہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ جس نے رسول کی اطاعت کی صرف اسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ نیز رسول جس چیز کو حرام کرتا ہے وہ اپنے رب کے حکم سے حرام کرتا ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی)۔

اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام احمد، دارمی، ابو دارمی، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد سے روایت کیا ہے۔

وہ حضرات جن کو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولِ کریم کی صداقت پر ایمان ہے انہیں تو اس واضح اور بین ارشادِ نبوی سننے کے بعد منکرینِ سنت کی غوغا آرائیاں اور پھبتیاں راہِ حق سے نہیں بھٹکا سکتیں۔ ان کے لئے یہ فتنہ کوئی نیا نہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اور وہ تو بغیر گھبرائے اس فتنہ کا نہایت پامردی سے مقابلہ کریں گے اور اپنے ایمان کی متاعِ عزیز کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد فرمائے گا۔ کیونکہ حضور کریم ؐ نے اس دارِ فانی میں زیادہ دیر اقامت گزیں نہیں ہونا تھا اور حضور ؐ کے بعد امورِ مملکت کی ذمہ داری خلفاء اور امراء نے سنبھالنی تھی۔ اس لئے ان کی اطاعت کا بھی حکم دیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء ۵۹)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور امراء کی جو تم سے ہوں۔

لیکن اطاعت رسول اللہ اور اطاعتِ امیر میں ایک بین فرق ہے اس بات کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا کہ نبی جملہ امور میں خصوصاً تبلیغ احکامِ شرعی میں بالکل معصوم عن الخطا اور منزہ عن النسیان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت کا جہاں حکم دیا غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا۔ مثلاً

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (الحشر ۷)

ترجمہ:۔ جو کچھ تمہیں رسول دے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔

رسول کا ہر حکم واجب التسلیم ہے اور اٹل۔ اس میں کسی کو مجال قیل وقال نہیں۔ لیکن خلیفہ کے معصوم ہونے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا۔ اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی مشروط اطاعت کا حکم دیا کہ اس کے حکم کو خدا و رسول کے فرمان کی روشنی میں پرکھو۔ اگر اس کے مطابق ہے تو اس پر عمل فرض۔ ورنہ اسے چھوڑ دو وہ ہرگز واجب التسلیم نہیں حضور کریم کا ارشاد ہے۔

لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ اللہ۔

خدا کی نافرمانی کر کے مخلوق کی فرمانبرداری ہرگز جائز نہیں۔

اس لئے اطاعتِ حاکمِ وقت کا حکم فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۵۹)

ترجمہ:۔ پھر اگر تم میں کسی بات پر جھگڑا اٹھے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف۔

اس آیت کا معنی بھی انہوں نے عجیب و غریب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اے ایمان والو! مرکزی حکومت کی اطاعت کرو اور ماتحت ملازمین کی اگر تمہارا جھگڑا ہو جائے تو مرکزی حکومت کے پاس اپنا جھگڑا لے بھیج دو۔"

وہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کوئی نظام حکومت اس طرح قائم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن وحدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔"

درست فرمایا آپ نے! واقعی دنیا کا کوئی نظام اس طرح نہیں چل سکتا کہ اس کے ہر حکم کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ لیکن حضرت والا شان ہم تو اسلامی نظام کے متعلق کلام کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک اسلامی نظام بھی قرآن وحدیث کا چیلنج قبول نہیں کر سکتا۔ آپ ایسے دانشمندوں کو تو ایسی بے سروپا بات زیب نہیں دیتی۔ اسلامی نظام حکومت اور قرآن وحدیث کا چیلنج قبول نہ کر سکے عجب طرفہ ہے۔

بارہا اہلِ حق نے حکومت وقت کے احکام کو کتاب وسنت کے میزان میں تولا اور جہاں کہیں نقص دیکھا بڑی جرأت سے اس کی اصلاح کر دی۔ کیا آپ کو یاد نہیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب عورتوں کے مہر کی حد مقرر کرنی چاہی تو عین اس وقت جب کہ وہ پیکرِ سطوت وجلال مسجد نبوی میں خطبہ دے رہا تھا ایک بڑھیا نے ان کو قرآن کی ایک آیت سنا کر ان کے حکم پر قلمِ تنسیخ پھروا دی۔

روی ان عمر قال علی المنبر الا لا تغلوا فی مھور نسائکم فقامت امراۃ فقالت یا بن خطاب اللہ یعطینا وانت تمنعنا وتلت الآیۃ وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا فقال عمر اصابت امراۃ واخطأ عمر ورجع من کراھۃ المغالاۃ۔[1]

ترجمہ:۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ منبر پر اثنا خطبہ میں لوگوں کو عورتوں کے گراں مہر مقرر کرنے سے منع کیا۔ ایک عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی اے خطاب کے فرزند! اللہ ہمیں دیتا ہے اور تو روکتا ہے اور یہ آیت پڑھی وَإِنْ أَرَدْتُمُ الخ یعنی اگر تم ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرنے لگو تو پہلی بیوی کے مہر سے کچھ نہ لو خواہ وہ کتنا ہی گراں کیوں نہ ہو؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ بولے کہ ایک عورت نے صحیح کہا اور ایک امیر سے خطا ہوئی۔ اس کے بعد اس حکم سے (جو آیت کا چیلنج قبول نہ کر سکا تھا) رجوع کیا۔

حضرت صدیقؓ کا پہلا خطبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ شہرۂ آفاق خطبہ جو آپ نے اپنی خلافت کے پہلے روز دیا تھا کے یہ الفاظ اوراقِ تاریخ سے کون محو کر سکتا ہے؟

ایھا الناس انی ولیت امرکم ولست بخیرکم۔ ایھا الناس انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعینونی

[1] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۵ ص ۹۹

و ان زغت فقوموني ۔ (ابن سعید)

ترجمہ:۔ اے لوگو! مجھے تمہاری امارت سونپی گئی ہے اور میں اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتا، اے لوگو! میں قرآن وسنّت کا متبع ہوں اور اپنی طرف سے خلافِ قرآن وسنت کوئی قانون نافذ کرنے والا نہیں ہوں پس اگر میں حسن وخوبی سے اتباعِ قرآن وسنت کرتا رہوں، تو میری امداد کرنا، اگر مجھ میں ذرا سا میل اور کجی پاؤ تو مجھے درست کردو۔

شاہِ رُوم کے دربار میں حضرت معاذؓ کی تصریح

اس سلسلہ میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وہ الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے شاہ روم کے دربار میں کہے تھے۔

وامیرنا منا ان عمل فینا بکتابنا وسنة نبینا اقررناه علینا وان عمل بغیر ذلک عزلناه عنا۔ (فتوح الشام)

ترجمہ:۔ ہمارا خلیفہ ہمیں میں سے ایک ہے۔ اگر وہ ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کے مطابق عمل پیرا رہے تو ہم اسے اپنا خلیفہ مقرر کئے رکھتے ہیں۔ اور اگر قرآن وسنت کی خلاف ورزی کرے تو ہم اسے خلافت سے معزول کردیتے ہیں۔

گویا صحابہ کرام کے نزدیک سنت نبوی سے روگردانی ایسا جرم تھا کہ اس کے ارتکاب کے بعد خلیفہ اس قابل نہیں رہتا کہ امت مسلمہ اس کی اطاعت کرے۔

منکرینِ سنت کی مندرجہ بالا تشریح سے تو صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ صرف حدیث کے حجت ہونے کے منکر نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے نافذ کردہ احکام کے سامنے احکام

قرآنی کو بھی وہ کچھ زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ تو پھر یہ صاف طور پر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ مرکزی حکومت جو حکم دے اسے مانو اور اس کی پرواہ نہ کرو کہ وہ فرمانِ خداوندی کے موافق ہے یا مخالف۔

واقعی سچ ہے یہ ارشاد باری مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اللہ کی اطاعت بھی وہی کرسکتا ہے جو رسول کے حکم کا پابند ہے اور جو اس کی پابندی سے قاصر ہو اس سے تعمیلِ فرمانِ الٰہی تو ہو سکتی ہی نہیں ؎

خلاف پیمبر کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اِسلامی سیاست کے بنیادی اصول

زیرِ نظر آیت کو ایک بار پھر اوّل سے آخر تک نہایت غور وفکر سے پڑھئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اُسے لوٹا دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بات (یعنی اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لئے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا) اچھی ہے اور اس کا انجام بہت بہتر ہے۔

ان مختصر سے الفاظ میں قانون وسیاست کے تمام قواعد وضوابط حسن و خوبی سے سمیٹ کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اسی میں قرآن کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ یہی چیز

اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کا نتیجۂ فکر نہیں بلکہ خود کتاب ہستی کے خبیر و علیم مصنف کا مایۂ ناز شاہکار ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان اصولوں کی تعلیم دی ہے جن کی برکت سے ہمارا نظام تشریعی تمام دنیا کے تشریعی نظاموں سے زیادہ ترقی یافتہ اور ہمارا سیاسی دستور تمام ممالک کے دستوروں سے زیادہ مستحکم ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر اور یوم قیامت پر ایمان لانے کے بعد ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان اصولوں پر عمل کریں۔

ان اصولوں کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱ــــ قرآنِ کریم اور اس پر عمل جسے اطاعت اللہ کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲ــــ سنت نبی کریم کی پیروی جسے اطاعت رسول کہا گیا ہے۔

۳ــــ اپنے امراءِ حکومت کے احکام کی اطاعت اسے ہی اجماعِ امت بھی کہا جاتا ہے۔

۴ــــ اور اگر خلافتِ الٰہیہ کے کارکنوں کے درمیان کسی بات پر اختلاف رائے ہو جائے تو اس کا تصفیہ کرنے کے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔

رفعِ اختلاف کے اسلامی اور غیر اسلامی طریقوں میں موازنہ

آراء و افکار کا اختلاف ایک طبعی چیز ہے۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان ہوں یا مجلس وزارت کے افراد جب وہ کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس پر اتفاق رائے ہو اکثر مسائل ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح کا اختلاف رائے ضرور پایا جاتا ہے۔ اب اس اختلاف سے بچ نکلنے اور کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے دو طریقے ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا دوسرا وہ جو انسانی عقل

و فکر نے ہزارہا سال کی تفکرِ عمیق اور تلخ تجربات کے بعد اپنے لئے وضع کیا۔ اب ذرا ان دونوں نظریوں پر تحلیلی نظر ڈالئے۔ آپ خود ہی کہہ اٹھیں گے کہ وہی نظریہ درست ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے۔

وہ نظریہ جو انسان نے اختلاف کو ختم کرنے کے لئے وضع کیا ہے اور جو آج تمام جمہوری حکومتوں میں رائج ہے وہ تو یہ ہے کہ اختلافی مسئلہ پر رائے شماری کی جائے اور صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کثرت آراء سے کیا جائے۔ لیکن یہ حقیقت کسی سے بھی مخفی نہیں کہ صحت و عدم صحت کا یہ معیار قابل اعتماد نہیں۔ ایک سو ناواقف ارکان کی متفقہ رائے سے دس تجربہ کاروں کی رائے ہی صحیح ہوتی ہے۔ اب اگر ان ایک سو ارکان کی رائے کو صرف اس لئے درست مان لیا جائے کہ وہ ایک سو ہیں اور دس ماہرین کی رائے کو اس لئے غلط قرار دے دیا جائے کہ ان کی تعداد صرف دس ہے تو کیا یہ عقل و دانش کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا اور کیا یہ عدل و انصاف کا خون نہیں ہوگا۔

اور جہاں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے وہاں تو اس طریقِ کار سے صورت حال اور بدتر ہو جاتی ہے۔ پارٹی کے ممبر قانونی طور پر اپنے لیڈر کی ہر بات کی تائید کرنے کے پابند ہیں اور حزب مخالف کتنی معقول بات ہی کیوں نہ کہے اس کی مخالفت صرف اس وجہ سے کرنی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ ایسا نہ کرنے سے پارٹی کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

پارٹی کے کئی آزاد منش اور حقیقت پسند ارکان اس کورانہ تقلید سے تنگ آکر پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی الگ پارٹی بنا کر اپنے خیالات اور آراء کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ اور اگر قسمت نے یاوری کی اور حالات ساز گار ہوئے اور یہ خود برسرِ اقتدار آگئے تو وہی المیہ وہ خود دہراتے ہیں جس سے برداشتہ خاطر

ہو کر انہوں نے نئی پارٹی کی بنیاد رکھی تھی بے اعتمادی کا یہ چکر قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اسے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم کر کے رکھ دیتا ہے۔ رقابت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے سازشیں کی جاتی ہیں۔ اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور مقابل کی دلیلوں کو جھٹلایا جاتا ہے۔ دلائل کی شکست و ریخت کا المناک منظر دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دور نہ جائیے اپنے گھر میں دیکھئے کیا ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ وہ اسلامیان ہند کی وحدت کا عنوان، ان کی آرزوؤں کا مرکز، وہ فولادی چٹان جس سے ٹکرا کر انگریزی استعمار اور ہندو سامراج پاش پاش ہو گیا۔ آج اس کی صفوں میں انتشار کیوں ہے۔ اس کی صف اول کے سپاہی آج کیوں دوسرے معسکروں میں دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کی عظمت کہاں گئی۔ وہ آج کیوں اپنی بقا کے لئے حکومت کا سہارا لینے پر مجبور ہے اس لئے کہ اس کے ارباب بست وکشاد نے اختلافی امور کا فیصلہ اکثریت رائے سے کیا اور اقلیت ان فیصلوں سے مطمئن نہ ہو سکی اور کٹتی گئی یہاں تک کہ آج مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم ان ناموں سے خالی ہیں جن کے ساتھ جنگ آزادی کی تاریخ وابستہ ہے۔

اختلافات کو دور کرنے کے لئے جو تجویز اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر مجلس دستور ساز کے ارکان، یا کابینہ کے افراد یا کسی کمیٹی یا سب کمیٹی کے ممبران میں کسی مسئلہ پر باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے ازالہ کا طریقہ یہ ہے کہ

فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

اسے لوٹا دو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف

اگر تم ان کے بیان کردہ قواعد عامہ اور اصولوں کے مطابق فیصلہ کرو گے تو یقیناً یہ اختلاف دور ہو جائے گا اور تمہارے اتحاد کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ کیونکہ اگر

کسی فیصلہ کو قرآن و سنت کی کسی نص سے تقویت پہنچ جائے گی۔ تو تمام مخالف رائے رکھنے والے بھی سر تسلیم خم کر دیں گے اور ساری امت بھی اس فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے دل وجان سے مستعد ہو جائے گی اور مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق جو ان کی عزت وعظمت کا کفیل اور بقا کا ضامن ہے عقول انسانی کے دائمی نزاع و اختلاف کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

کہ تمہیں ضرور اپنے اختلافی مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں کرنا چاہئے اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ جو اس ارشاد پر عمل نہیں کرتے ان کو بھی اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان نہیں ورنہ اس کی نافرمانی کیوں کرتے اور قیامت کے دن کا یقین نہیں ورنہ وہ آخرت کے نعیم ابدی کے عوض اپنی اس فانی آسائش وعظمت پر قانع نہ ہوتے۔ پھر بھی یہ تصریح فرما دی کہ ایسا کرنے سے یہی نہیں کہ فقط تمہاری عاقبت سنور جائے گی۔ بلکہ یہ تو ایسا حکم ہے جس میں دنیاوی سعادتیں بھی پنہاں ہیں۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے یہی طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بہت بہتر ہے کہ تم کتاب وسنت کی طرف رجوع کرو۔

ایک دوسری آیت کریمہ میں جہاں باہمی نزاع وافتراق کی مذمت کی گئی ہے اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے وہاں یہی بتایا گیا ہے کہ تشتت وافتراق کے ہولناک انجام سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال)

اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا۔ اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامراد وناکام ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کریم جس کے بیان کردہ اصولوں اور جزئیات کو زبان سے تو وہ بھی غیر متبدل کہتے ہیں اس میں تو حکیم وخبیر خدا کا یہ ارشاد ہے کہ اگر باہمی اختلافات اور جھگڑوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ میری اطاعت کرو اور میرے پیارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو اور ان کے حکموں پر کاربند رہو۔

اور یہ حضرات عامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود یہ کہے جاتے ہیں کہ سنتِ رسول کی اطاعت سے امت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ امت اگر زندہ رہنا چاہتی ہے تو ہمارے ارشادات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اب یہ ستم رسیدہ امت اپنے نئے نئے مسیحاؤں اور کرم فرماؤں سے تنگ آکر یہ نہ کہے تو کیا کہے کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔

باب دوم

فصل اول

بیانِ قرآن کا منصب

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام یقین کرنے والے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور ہم احکام قرآنی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے مجبور ہیں کہ ارشاداتِ نبوی کا سہارا لیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کا صحیح علم اپنے رسول کو سکھایا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اپنی امت کو اس کی تعلیم دیں تاکہ قرآن کی ابدی حقائق اور اٹل صداقتوں پر اہواءِ انسانیہ مطامعِ شخصیہ یا کوئی مخصوص ماحول اثر انداز نہ ہو سکے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل:۴۴)

اور اتارا ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تاکہ آپ (اے میرے رسول) کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہو گیا کہ قرآن کریم کی جو تفسیر اور تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہی قابلِ اعتماد ہے اور اس کے خلاف اگر کوئی اور قرآن کی تفسیر کرے خواہ وہ کتنا ہی علامہ، کتنا ہی دانشمند اور کتنا ہی قرآن واسلام کی

خدمت کا مدعی ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔

رسول مبعوث کرنے کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اپنی کتاب کی تفسیر و توضیح کا منصب تفویض کیا اور اس کے ساتھ اپنی تمام مخلوقات کو نہایت ہی کھلے الفاظ میں یہ بھی حکم دیا کہ رسول جو کچھ کہے، بلا چوں و چرا اسے تسلیم کریں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں ذرا بھر تساہل نہ برتیں۔ کیونکہ رسول مبعوث کرنے کا مقصد ہی صرف یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کا ہر حکم مانا جائے۔ ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۶۴)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے اللہ کے حکم سے۔

اب اگر رسول کی اطاعت سے روگردانی کی جائے اور قرآن کی اس تفسیر اور بیان کو ناقابلِ عمل سمجھا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کریم کی صدہا آیتیں ساقط الاعتبار اور منسوخ ہو چکی ہیں اور اب وہ اس لائق نہیں کہ ان کی پابندی کی جائے۔ لیکن ایسا کہنے کی جرأت تو کوئی مسلمان بھی نہیں کر سکتا اس لئے ہم قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے کے بعد مجبور ہیں کہ اطاعتِ رسول سے اعراض نہ کریں اور اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کریں کہ ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی اپنے ہادی و مرشد کے ارشادات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔

تدوینِ سنت پر شبہات

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ہمیں ان شکوک و

شبہات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ جو احادیث کی جمع و تدوین کے متعلق منکرینِ سنتِ نبوی کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔

ان حضرات کا یہ خیال ہے کہ احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کا کام عہدِ رسالت سے دو تین سو سال بعد شروع ہوا اور محدثین نے لوگوں سے یوں ہی سُنی سنائی باتیں بغیر کسی تحقیق کے اپنی کتابوں میں جمع کر دیں اور پھر انہیں دین بنا دیا۔ ان سے پہلے صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں احادیث کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس عرصہ میں بے شمار جھوٹی حدیثیں لوگوں نے اپنی طرف سے حضورؐ کی طرف منسوب کر دیں اور پھر فرماتے ہیں کہ بھلا جو چیز اتنی مدت دراز کے بعد مدون کی گئی ہو اس پر ہم کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔

نیز اگر حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد یہ ہوتا کہ احادیث پر بھی قیامت تک عمل کیا جائے تو ضرور احادیث کی حفاظت کے لئے وہی انتظامات کئے جاتے جو قرآن کو محفوظ رکھنے کے لئے کئے گئے تاکہ احادیث بھی تغیر و تبدل سے محفوظ رہتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احادیث کی طرف التفات نہ فرمانا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ حضور اکرمؐ کا یہ خیال نہیں تھا کہ احادیث پر بھی قیامت تک عمل کیا جائے۔

یہ ہے ان کے شکوک و شبہات کا خلاصہ جن کے زیرِ اثر وہ آیاتِ کثیرہ کے باوجود سنتِ نبوی کو ترک کرنے پر مُصر ہیں۔

ان شبہات کا مصدرِ حقیقی

یہ بعینہٖ وہی اعتراضات ہیں جو عام طور پر مستشرقین کی طرف سے احادیثِ نبوی پر کئے جاتے ہیں۔ ان کے اعتراضات کی وجہ تو کھلی ہوئی ہے وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے انبیاء کے اقوال و اعمال کی حفاظت تو کجا اپنے ان آسمانی صحیفوں اور کتابوں کو بھی تحریف و تغیر سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور یہ مسلمان آج اتنی صدیاں گزر جانے

کے بعد بھی اپنے آقا و مولا کے ہر قول و عمل نشست و برخاست ، جنگ و صلح ، سفر و
حضر ، خانگی اور اجتماعی زندگی کی تمام تفصیلات کو نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ
بتلا سکتے ہیں ۔ اور ان کے سینے تمام ارشاداتِ نبوی کو یوں محفوظ کئے ہوئے ہیں کہ اگرچہ
ان کے سیاسی اقتدار میں زوال آگیا لیکن ان کا دین اسی طرح پر شباب اور قوی
ہے ۔ اُن کے پاس ایسے وسائل تو ہیں نہیں کہ اپنی مقدس کتابوں کو اس تحریف سے
پاک کر سکیں جو اُن کا جزو بن چکی ہے ۔ اس لئے وہ اس کوشش میں شب و روز
منہمک رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کو اپنے دین سے بدظن کر دیا جائے اور ان کے
دلوں میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ یہ کتابیں جن کی صحت پر وہ ایمان رکھتے
ہیں یہ تو ان لوگوں کی جمع کردہ ہیں جو پرلے درجہ کے جھوٹے اور مفتری تھے اور کئی
صدیاں گزرنے کے بعد یہ حدیثیں انہوں نے لوگوں سے سن کر حضور کریمؐ کی طرف
منسوب کر دیں اور وہ شہرت و ناموری کے اس قدر بھوکے تھے کہ اپنے رسول کی
طرف جھوٹی حدیثیں منسوب کرنے سے بھی قطعاً نہیں ہچکچاتے تھے ۔

مستشرقین کے اعتراضات کی وجہ تو معقول ہے لیکن ان حضرات کے (یعنی
منکرینِ سنت) محدثین سے یوں برافروختہ خاطر ہونے کی وجہ ناقابلِ فہم ہے ۔ ان کو تو
معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے اسلاف نے کس محنت اور کوشش سے ان کی کتاب
اور ان کے رسول کی سنت کی حفاظت کی ، بجائے اس کے کہ وہ اپنے محسنوں کا
شکریہ ادا کرتے وہ ان پر پھبتیاں کسنے اور ان کو مفتری اور کذاب ثابت کرنے
کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کر رہے ہیں ۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ○

کیا احسان کا بدلہ صرف احسان ہی نہیں ۔

یہ ہماری کتنی بدبختی ہے کہ ہم اسلام کے مطالعہ کے لئے ان کتابوں کو

منتخب کرتے ہیں جو اسلام کے بدترین دشمنوں کی متعصب ذہنیتوں کی زہر آلود
تصانیف ہیں پھر ہمیں ان کے مصنفین کی دیانت اور غیر جانبداری پر اس قدر اعتماد
ہے کہ ان کے ہر اس خیال کو بھی جو حقیقت و صداقت کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے تحقیق و
تدقیق کا نچوڑ تصور کر لیتے ہیں اور کبھی ہم نے ان مصنفین کی تصنیفات کے مطالعہ کی
زحمت گوارا نہیں کی جن کی زندگی کا ہر لمحہ علومِ اسلامی کی تحقیق و تفتیش میں گزرا
جن کے دل ، دماغ اور قلم نے یک زبان ہو کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ
پڑھا ۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مغربی علماء میں ہزاروں اور عیب کیوں نہ ہوں
وہ شراب کیوں نہ پئیں ، وہ رقص و سرود کی محفلوں میں دادِ عیش کیوں نہ دیتے ہوں
عفت و پاکبازی سے وہ کوسوں دور کیوں نہ ہوں لیکن جب وہ میدانِ تحقیق میں قدم
رکھتے ہیں تو ان کا راہوار قلم جادۂ حق سے نہیں بھٹکتا ۔ وہ یکسر ذاتی ، قومی اور وطنی
آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں ۔ یہ تو ممکن ہے کہ سورج چمکنا چھوڑ دے اور ستاروں
کی جگمگاہٹ ختم ہو جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ مغربی فاضل تحقیق کرتے وقت
صداقت و حقانیت کا دامن چھوڑ دے اور ہمارے بہترین دل و دماغ ان شعبدہ
بازانِ فرنگ کے فکرِ عیار کی بنائی ہوئی زنجیروں کو تحقیق کے موتیوں کی لڑیاں سمجھ
کر زیبِ گلو کر لیتے ہیں ۔ اور اس اندھی تقلید کے باوجود اپنے آپ کو آزاد منش اور
محقق سمجھتے ہیں ؎

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

اور یہ لوگ تو ہم سے اس وقت تک خوش نہ ہوں گے جب تک ہم خدا کے
محبوب کی غلامی کا رشتہ گلے سے نکال کر پھینک نہ دیں ۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ ۱۱۶)

ہرگز خوش نہ ہوں گے تم سے یہود و نصاریٰ جب تک تم ان کا دین نہ اختیار کر لو ۔

دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کا رد اور اپنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم احادیثِ نبوی کے مرتب و مدوّن ہونے کی تاریخ کا اور ان شخصیتوں کے احوالِ زندگی کا جنہوں نے یہ فرض ادا کیا بنظر انصاف مطالعہ کریں تاکہ حقیقت خود بخود نکھر کر سامنے آجائے اور حق وباطل میں مکمل تمیز ہو جائے۔
وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

تاریخ تدوینِ احادیث

آسانی کے لئے ہم حدیث کے مرتب ہونے کے دَور کو چار حصّوں میں تقسیم کر لیتے ہیں تاکہ مفصّل طور پر معلوم ہو سکے کہ ہر عہد میں احادیثِ نبوی کو محفوظ رکھنے کے لئے مسلمانوں نے کیا کچھ محنت اور جانفشانی کی۔

۱۔ عصرِ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
۲۔ عہدِ صحابہ رضوان اللہ علیہم
۳۔ عہدِ تابعین رضوان اللہ علیہم
۴۔ تابعین کے بعد کا زمانہ

عصرِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

از ۱ھ بعثت تا ۱۱ھ ہجری مدت ۲۳ سال

عالمِ انسانیت کی شب دیجور کی نورانی صبح جب وہ مہرِ جہاں افروز طلوع ہوا کتنی پرکیف تھی۔ اس کی حیات بخش کرنوں کی تاثیر سے بے حس ذروں میں بھی زندگی کروٹیں لینے لگی۔ اس کی شوخ تجلیوں نے نشیب وفراز صحرا و کہسار کو بقعۂ نور بنا دیا۔ خزاں زدہ باغ ہستی میں سرمدی بہاریں پھر مستانہ وار جھومنے لگیں اور انسان اپنا

کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لئے پھر مصروف تگ و پو نظر آنے لگا۔
دنیا حیران ہے کہ وہ نبی جس کی پہلی دعوت پر سارا عرب آگ بگولا ہو گیا اور آنکھوں میں غصّہ ونفرت کے انگارے ناچنے لگے۔ جنہوں نے اس نبی کی آواز سننے سے اپنے کان بند کر لئے اور اس کی طرف دیکھنے سے آنکھیں میچ لیں جو اپنی پوری اجتماعی طاقت کے ساتھ اپنے گھروں سے بارہا تیر و سناں لے کر اسے مٹانے کے لئے نکلے تھے۔ کس طرح اس کے اشارہ پر جانِ عزیز تک نثار کرنے لگے۔ وہ ہستی جس کی ہر بات سے انہیں چڑ تھی کس طرح ان کی عادات وشمائل بلکہ احساس و تخیل کی محاسب بن گئی۔

صحابہ کرام کو جو عقیدت و نیازمندی، محبت وشیفتگی اس پیکرِ حسن و رعنائی، جامع صفاتِ انبیاء و رُسل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے تھی۔ اس کی مثال نہیں۔
اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب موازنہ کیا ہے ؎

حُسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں تیرے نام پہ مردانِ عرب

عُروہ بن مسعود ثقفی نے صحابہ کی نیازمندیوں کا جو نقشہ کھینچا اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۶ھ میں چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے عازمِ مکہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفّارِ مکہ نے مزاحمت کی اور آگے جانے سے روک دیا اور مسلمانوں کی قوت کا جائزہ لینے کے لئے عروہ بن مسعود ثقفی کو مسلمانوں کی قیام گاہ بھیجا۔ عروہ طائف کا رئیس تھا۔ اور اسی کے اشارے پر طائف کی گلیوں میں نبی اکرم کی پنڈلیوں کو اوباشوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کیا تھا۔ وہ ابھی تک مشرف بہ اسلام بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے واپس آکر کفّارِ مکہ کو کہا:۔
اس شخص سے صلح کر لو اس کے مقابلہ کی تم میں تاب نہیں۔ میں قیصر

روم، کسریٰ ایران اور بادشاہِ حبش کے درباروں میں گیا ہوں۔ میں
نے کسی رعایا کو اپنے بادشاہ سے وہ والہانہ محبت کرتے نہیں دیکھا
جو میں نے غلامانِ محمد میں دیکھی ہے۔ ان کی زبان سے کوئی حکم نکلتا
ہے تو سب بیتابانہ وار اس کی تعمیل پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اگر وہ
وضو کرتے ہیں تو پانی کے قطرے زمین پر گرنے نہیں دیتے بلکہ اپنے چہرہ
پر مل لیتے ہیں وہ تھوکتے ہیں تو اسے بھی وہ جسم پر مل لیتے ہیں۔ ان کی
حجامت کے بالوں کو بھی وہ تبرک کے طور پر محفوظ رکھتے ہیں جس
قوم کو اپنے سالار سے اتنا عشق ہو اس پر غالب آنا ناممکن ہے۔

یہ رائے کسی عقیدت مند کی نہیں، کسی غیر جانبدار مبصر کی نہیں بلکہ اس
دشمن کی ہے جس کی بہترین تمنا یہی تھی کہ مسلمان صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح
مٹا دیئے جائیں۔

اگرچہ صحابہ کی ہر ادا عشقِ مصطفویؐ کی غماز تھی لیکن عشق کی سرمستیوں اور
خود فراموشیوں کے جو مناظر میدانِ جنگ میں دیکھنے میں آئے وہ آج تک دانشمندانِ
عالم کے لئے ایک معمہ ہیں۔

سترہ رمضان المبارک ۲ھ کو بدر کے میدان میں حق و باطل کی پہلی ٹکر ہوئی
ایک طرف کفار کا مسلح لشکر تھا جس کی آتشِ غضب کو تیز تر کرنے کے لئے
دوشیزگانِ عرب کی شعلہ نوائیاں تیل کا کام کر رہی تھیں۔ ادھر صرف تین سو تیرہ
اور وہ بھی نہتے جنہیں صرف محبوبِ دو عالم کی دعا کا سہارا تھا۔ جنگ سے ایک
روز پہلے حضورؐ نے مجلسِ مشاورت طلب کی اور صحابہ سے جنگ کے متعلق دریافت
فرمایا۔ مہاجرین نے عرض کی یا رسول اللہ ہم حاضر ہیں۔ حضورؐ نے دوسری دفعہ پھر یہی
مہاجرین نے پھر یہی جواب دیا۔ لیکن تیسری بار پھر لبِ مصطفوی پر یہی سوال تھا۔

اب انصار سمجھے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے اس وقت حضرت مقدادؓ اٹھے
اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ فداك ابی وامی آپ ہم (سفتہ گانِ تیر نگاہ اور کشتگانِ
خنجر ابرو) سے خطاب فرما رہے ہیں ہم قومِ موسیٰ نہیں کہ جنگ کے وقت فَاذْهَبْ
اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ کہہ کر ٹال دیں ہم تو حضورؐ کے
غلام ہیں اگر پہاڑ سے ٹکرانے کو کہیں تو ٹکرا جائیں، آگ میں کودنے کا حکم دیں تو
کود جائیں اور اگر سمندر میں چھلانگ لگانے کا اشارہ پائیں تو چھلانگ لگا دیں،
جس سے حضورؐ کی صلح اس سے ہماری صلح، جس سے حضورؐ کی جنگ اس سے
ہماری جنگ۔ یہ سن کر حضورؐ کے لبِ جاں بخش پر مسکراہٹ آ گئی۔

ارشاداتِ نبوی کے متعلق صحابہ کا شدید اہتمام

آپ اندازہ فرمائیں کہ جہاں عشق و محبت، ادب و احترام اور جانبازی و سرفروشی
کا یہ عالم ہو کیا ایسے دل ربا محبوب کے الفاظ فراموش ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کو حضورؐ
کے ارشادات کی اہمیت کا پورا احساس تھا وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ حضورؐ کا کوئی
حکم ایسا نہ ہو جس کا انہیں علم نہ ہو۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ سے دو
تین میل باہر ایک جگہ ایک انصاری بھائی حضرت عتبان بن مالکؓ کے ساتھ رہتا
تھا۔ ہم نے باری مقرر کر رکھی تھی ایک روز میں بارگاہِ رسالت میں حاضر رہتا اور
حضورؐ کے ارشادات سنتا اور شام کو واپس آ کر اسے سنا دیتا۔ دوسرے روز وہ
حاضر ہوتے اور میں کام دھندا کرتا۔ اکثر صحابہ جو ہر روز حاضر نہ ہو سکتے ان کا یہی
دستور تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کا ایک خاص گروہ تھا جنہیں اصحابِ صفہ کے
نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا کام بجز تعلیم و تعلّم اور حاضری بارگاہِ اقدس کے
کچھ نہ تھا۔ وہ فقر و فاقہ کی سختیاں خوشی سے برداشت کرتے۔ پھٹے پرانے کپڑے

پہنتے۔ انہوں نے دنیا کے لذائذ کو بطیبِ خاطر ترک کر رکھا تھا اور شب و روز مسجدِ نبوی میں رہتے اور حضورؐ کے ارشادات سنتے اور انہیں یاد رکھتے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسی گروہ میں سے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی کثرت روایات کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

تم یہ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ بہت کثرت سے حدیثیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتا ہے۔ ہم سب کو بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونا ہے (اس لئے میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک مسکین آدمی تھا اور جو کچھ کھانے کو مل جاتا اسی پر قناعت کرتا اور ہمیشہ بارگاہِ رسالت میں حاضر رہتا اور مہاجرین بازاروں میں تجارت کی وجہ سے اور انصار اپنے اموال کی حفاظت کی وجہ سے مشغول رہتے۔ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا تو حضورؐ نے فرمایا جو شخص جب تک میں اپنی یہ بات ختم نہ کرلوں اپنی چادر بچھائے رکھے اور پھر اُسے اکٹھا کرے تو اس کے بعد جو کچھ وہ مجھ سے سنے گا وہ اُسے نہیں بھولے گا۔ پس میں نے اپنی چادر بچھائی جو میں اوڑھے تھا۔ مجھے اس خدا کی قسم جس نے میرے نبی کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اس کے بعد میں نے حضور انورؐ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ بھی سنا وہ مجھے فراموش نہیں ہوا[1]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کو فرمایا:۔

انت کنت الزمنا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و احفظنا لحدیثہ[2]

[1] بخاری. کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ.
[2] الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ لابن حجر ۶ ص۲۰۵

اے ابوہریرہ تجھے ہم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میسر آئی اور تجھے حضورؐ کی احادیث ہم سے زیادہ یاد ہیں۔

ان کے علاوہ صحابہ کرام کی کثیر تعداد خاص کوشش سے احادیثِ نبوی کو یاد کیا کرتی تھی۔ چنانچہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا شمار حفاظِ سنت میں ہوتا تھا۔

سنّتِ نبوی کو یاد کرنے کی تاکید

مزید برآں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا اپنے صحابہ کو تاکید کی اور انہیں شوق دلایا کہ وہ حضورؐ کے ارشادات اور خطبوں کو یاد کریں اور پھر انہیں دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کثیر التعداد ارشادات نبوی سے چند ایک پیش کرتا ہوں۔

نبی اکرم نے اپنی سنّت کو لاوارث نہیں چھوڑا

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأ اسمع مقالتی فوعاھا فاداھا کما سمعھا۔ (الاربعین للنووی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو پرنور کرے جس نے میری بات سنی۔ پھر اسے خوب یاد کیا اور اس کے بعد جیسے سنا ویسے ہی اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب ایک لاکھ سے زائد فرزندانِ توحید اکٹھے تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شہرہ آفاق خطبہ دیا اس کے چند آخری جملے ملاحظہ ہوں۔

وقال فان دمائکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ

يومكم هذا في بلدكم هذا في شهركم هذا وستلقون ربكم فيسألكم عن اعمالكم الا فلا ترجعوا بعدي ضلالا يضرب بعضكم رقاب بعض الا ليبلغ الشاهد الغائب فلعل بعض من يبلغه ان يكون اوعى له من بعض من سمعه۔[1]

ترجمہ: (اس جامع خطبہ کے اختتام پر جس میں تقریباً اکثر احکام شرعی کا بیان آ گیا) حضورؐ نے فرمایا، بیشک تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اس طرح حرام ہیں جیسے اس مبارک ماہ کا اس مقدس شہر (مکہ) میں یہ روز سعید۔ تم اپنے رب سے عنقریب ملو گے اور وہ ذوالجلال تمہارے اعمال کے متعلق تم سے پرسش کرے گا۔ دیکھو خبردار! کہیں میرے پیچھے پھر گمراہ نہ ہو جانا اور ایک دوسرے کی گردنوں کو نہ کاٹنا۔

کان کھول کر سنو! جو اس جگہ موجود ہیں ان پر فرض ہے کہ وہ یہ احکام ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس وقت موجود نہیں۔ ممکن ہے جن لوگوں کو یہ احکام پہنچائے جائیں وہ سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے سمجھ دار ہوں۔

حضور کریمؐ کے اس ارشاد سے الا لیبلغ الشاھد الغائب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ حضورؐ اپنے ارشادات کو یاد کروانے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے کے لئے کتنی سخت تاکید فرماتے ہیں۔

کیونکہ قرآن وسنت نبوی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے اور دین کے متعلق حضور کریمؐ نے جو کچھ تعلیم دی اس میں اپنی خواہش اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو جو قرآن نے بار بار دہرائی ہے اپنے

[1] صحاح ستة وغيرها من كتب الحديث۔

اس ارشاد میں اور واضح فرما دیا تاکہ کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انى قد خلفت فيكم شيئين لن تضلوا بعدهما كتاب الله وسنتى ولن يفترقا حتى يردا على الحوض۔[1]

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہارے لئے اپنے پیچھے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں (اگر ان پر عمل پیرا رہے تو) ہرگز گمراہ نہیں ہو گے (وہ دو چیزیں) اللہ کی کتاب (قرآن) ہے اور میری سنت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن حوض پر دونوں ایک ساتھ وارد ہوں۔

اس مضمون کی بے شمار صحیح احادیث موجود ہیں جن میں حضور اکرمؐ نے صحابہ کرام کو اپنے اقوال واحادیث کو یاد کرنے ان پر عمل کرنے اور آئندہ آنے والی نسلوں تک اس امانت کو پہنچانے پر بہت زور دیا ہے۔ خوفِ طوالت ہے ورنہ اس کتاب کے صفحات کو اس ہادئ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیات بخش اور زندہ جاوید اقوال واعمال سے مزیّن کرنے کی حسرت کو پورا کرتا۔ فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ممکن ہے قارئین کرام میں سے کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ استدلال کا یہ انداز منطقی نہیں کیونکہ دلیل ایسی ہونی چاہئے جس کے مقدمات فریقین کے نزدیک مسلّم ہوں اور یہ احادیث فی نفسہا کتنی ہی صحیح اور قوی ہوں۔ ان لوگوں کے لئے حجت نہیں جو احادیث کو تسلیم ہی نہیں کرتے اس لئے دلیل کے طور پر ان احادیث کو پیش کرنا صحیح نہیں۔

[1] اعلام الموقعين لابن قيم ج ۲ ص ۲۳۲۔

تو جواباً التماس ہے کہ مجھے اس چیز کا نہایت شدّت سے احساس ہے۔ اسی لئے پہلے باب میں میں نے اتباعِ سنّت نبوی کا وجوب ثابت کرنے کے لئے صرف آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا ہے کیونکہ وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم ان تمام احکامات کو ابدی اور غیر متغیر مانتے ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یہاں ان احادیثِ طیبہ کا ذکر کرنے سے مقصد صرف ان کے اس شبہ کا ازالہ کرنا ہے جس میں وہ بُری طرح مبتلا ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی امّت کو قرآن کے بغیر اور کچھ نہیں دیا اور اپنی سنت کو یاد کرنے، اسے محفوظ رکھنے اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے اور تا قیامت اس پر عمل پیرا رہنے کا کوئی حکم نہیں دیا۔ ان احادیث جن کی صحت پر علماءِ اُمّت کا اتفاق ہے کے مطالعہ سے امید ہے کہ ان کا یہ شبہ دُور ہو گیا ہو گا اور انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ نبی اکرم نے قرآن کریم کو یاد کرنے کے ساتھ اپنی سنت کو بھی یاد کرنے کے لئے اپنی اُمّت کو بار بار تاکید فرمائی۔

عصرِ رسالت میں سُنّت کی کتابت

عصرِ رسالتمآب میں اگرچہ احادیثِ نبوی کی حفاظت کا دارومدار اکثر قوتِ یاد وحفظ پر تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی قطعاً غلط ہے کہ اس زمانہ میں حضورؐ کے ارشادات بالکل قلمبند کئے ہی نہیں گئے۔ ایسی شہادتیں کثرت سے ملتی ہیں کہ بارہا حضور انورؐ نے خود کئی مسائل کو اپنی نگرانی میں لکھوا دیا اور کئی ایک صحابہ کو جن کو لکھنے کی پوری مہارت تھی انہیں احادیث کو ضبط کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ چنانچہ علامہ ابن قیم علیہ الرحمۃ اپنی کتاب زاد المعاد میں ان والاناموں کا جو حضور انورؐ نے اہل اسلام کو تحریر فرمائے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فمنها كتابه في الصدقات الذي كان عند ابي بكر وكتبه

ابو بكر لانس بن مالك لما وجهه الى البحرين وعليه عمل الجمهور ومنها كتابه الى اهل اليمن وهو الكتاب الذي رواه ابو بكر بن عمرو بن حزم عن ابيه عن جده وهو كتاب عظيم فيه انواع كثير من الفقه في الزكوٰة والديات والاحكام وذكر الكبائر والطلاق والعتاق واحكام الصلوٰة في الثوب الواحد والاحتباء فيه ومس المصحف وغير ذلك قال الامام احمد لاشك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كتبه واحتج الفقهاء كلهم بما فيه من مقادير الديات ومنها كتابه الى بني زهير ومنها كتابه الذي كان عند عمر بن الخطاب في نصب الزكوٰة وغيرها۔[1]

ترجمہ:- ان گرامی ناموں میں سے جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام شرعی کے متعلق مختلف لوگوں کو ارسال فرمائے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔۔۔ ایک گرامی نامہ زکوٰۃ کے متعلق تھا جو خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے پاس محفوظ تھا۔ اس کو حضورؐ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت انس بن مالکؓ کے لئے لکھا تھا جب انہیں بحرین کی طرف روانہ کیا۔ اور آج جمہور علماء کا عمل اسی خط کے مطابق ہے۔

۲۔۔۔ ایک گرامی نامہ اہل یمن کی طرف ارسال کیا۔ یہ وہ خط ہے جسے ابوبکر (تابعی ہیں) نے اپنے والد عمرو سے اور انہوں نے اپنے والد حزم سے روایت کیا۔ اور یہ بہت ہی عظیم الشان خط ہے۔ اس میں فقہ کے کثیر التعداد مسائل درج ہیں۔ زکوٰۃ، دیت اور احکام کے علاوہ کبیرہ گناہوں، طلاق،

[1] زاد المعاد علی ہامش انورقانی ج ۱، ص۱۰۳۔

غلاموں کی آزادی، ایک کپڑے میں نماز پڑھنے ایک ہی کپڑا اوڑھنے ، مصحف کو چھونے وغیرہ کے مسائل مذکور ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں کہ یہ حضورؐ نے لکھوایا ہے اور تمام فقہاء اس خط میں درج شدہ دیتوں کی مقدار پر عمل پیرا ہیں۔

٣۔ ایک گرامی نامہ وہ ہے جو بنی زہیر کو بھیجا گیا۔

٤۔ اور ایک وہ ہے جو خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہم اجمعین کے پاس تھا۔ اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور دوسرے امور کے متعلق احکام تھے۔

عہدِ رسالت میں جو حضرات احادیثِ طیبہ کو قلم بند کیا کرتے تھے ان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ و عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر کے متعلق تو حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول سے وضاحت ہوتی ہے۔ آپ سے مروی ہے۔

ما من اصحاب النبی احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ماکان من عبداللہ بن عمرؓ فانہ کان یکتب ولا اکتب[1]۔

ترجمہ: صحابہ کرام میں سے مجھ سے زیادہ نبی کریم سے کسی نے احادیث روایت نہیں کیں سوائے ابن عمرؓ کے کیونکہ وہ احادیث لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھا کرتا تھا۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے متعلق تو تصریح ملتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنے ارشادات تحریر کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں بخشی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

[1] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر ج ٤ ص ٢٠٣۔

عن عبداللہ بن عمرو قال کنت اکتب کل شئ اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی قریش فقالوا انک تکتب کل شئ تسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رسول اللہ بشر یتکلم فی الغضب فامسکت عن الکتاب فذکرت ذٰلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال " اکتب فوالذی نفسی بیدہ ماخرج منی الا الحق۔ (رواہ الامام احمدؒ)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی زبان پاک سے جو لفظ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ اس ارادہ سے کہ اسے یاد کروں گا۔ لیکن قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو وہ لکھ لیتے ہو اور رسول اللہ تو بشر ہیں کبھی غصہ میں بھی کچھ فرما دیتے ہیں۔ (ان کی اس بات سے متاثر ہو کر) میں نے لکھنا ترک کر دیا پھر میں نے اس چیز کا ذکر بارگاہِ رسالت میں کیا تو سرورِ عالم نے فرمایا " جو مجھ سے سنو ضرور لکھا کرو اس ذاتِ پاک کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے میری زبان سے حق کے بغیر اور کچھ نہیں نکلتا۔

اس حدیث میں دو کلمے خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ ایک تو حضرت عبداللہ کا یہ کہنا کہ میں اس لئے لکھتا تھا کہ اسے یاد کروں جس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں احادیثِ نبوی کے یاد کرنے کا عام ولولہ تھا اور اس کے لئے وہ اپنی طرف سے ہر امکانی کوشش کرتے تھے اور دوسرا ان کو نبی اکرم کا یہ صریح حکم "اکتب" کہ ضرور لکھا کرو اور ساتھ ہی اس حکم کی وجہ بھی بیان فرما دی "ماخرج منی الا الحق" کہ میری زبان سے حق کے بغیر کچھ نہیں نکلتا۔

[1] تفسیر ابن کثیر، والنجم ج ٤ ص ٢٤٧

اگر مندرجہ بالا تصریحات کو صرف دین کی تاریخ ہی تسلیم کر لیا جائے جس سے منکرانِ سنت کو بھی انکار نہیں تو کیا ایک منصف پر یہ حقیقت مہر نیم روز کی طرح عیاں نہیں ہو جاتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کو لاوارث نہیں چھوڑا۔ جیسے ان لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے بلکہ اس کی حفاظت، اس کی تبلیغ اور اس پر کاربند رہنے کے لئے صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والی امت کو نہایت واضح اور صریح انداز سے حکم فرمایا۔ اور صحابہ کرام نے اپنے آقا اور ہادی کے تمام ارشادات کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کے لئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کیں۔

جن احادیث میں قرآنِ کریم کے بغیر کچھ اور لکھنے سے منع کیا گیا ہے اس کے مخاطب عام لوگ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب عام طور پر لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سب سے پہلے اسلام نے ان کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ فنِ کتابت ان کے لئے بالکل انوکھا فن تھا۔ جس میں مشاق اور پختہ ہونے کے لئے کافی مشق اور وقت کی ضرورت تھی۔ اگر سنّتِ نبوی کو لکھنے کی عام اجازت دی جاتی تو اس سے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں نو آموزی کے باعث آیاتِ قرآنی کے ساتھ احادیث کا اختلاط نہ ہو جائے۔ اس خطرہ کے انسداد کے لئے عوام الناس کو روکا گیا۔ لیکن جو اس فن میں مہارت اور کمال حاصل کر چکے تھے انہیں صرف اجازت ہی نہیں بلکہ حکم دیا گیا کہ 'اکتب' ماخرج منی الا الحق۔ ضرور لکھو جو مجھ سے سنو۔ کیونکہ میں ہمیشہ سچ اور حق بات ہی کہتا ہوں۔

صلی اللہ تعالیٰ علی نبینا وحبیبنا محمد الذی لاینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ وعلیٰ آلہ بدور الدجیٰ واصحابہ اعلام الھدیٰ وبارک وسلم۔

فصل دوم

دورِ صحابہ

جب تک آفتابِ نبوّت خود عالم افروز رہا اس وقت تک صداقت کے ساتھ آمیزشِ کذب کا امکان تک نہ تھا۔ لیکن حضورؐ کے انتقال کے بعد مسلم معاشرہ تین عناصر پر مشتمل تھا۔ ایک تو وہ خوش نصیب تھے جو ایک مدت تک فیضِ صحبت سے بہرہ اندوز رہے جن کی آنکھیں مشاہدۂ جمال سے روشن تھیں اور دل جذباتِ عشق سے معمور۔ جس طرح پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں رہ کر دُرِّ یتیم بن جایا کرتا ہے اسی طرح رسالت مآب کے آغوشِ تربیت میں رہنے سے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں عدل وانصاف اور حق وصداقت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ دوسرا عنصر نومسلموں کا تھا جو زیادہ طور پر عرب کے بادیہ نشین اعراب اور ہمسایہ ممالک کے باشندے تھے انہیں فیضِ صحبت سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے وہ اسلام کے اصول وقواعد کی روح سے پورے طور پر مانوس نہ ہوئے تھے اور تیسرا عنصر مارہائے آستین منافقین کا تھا جو مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

قرآن کریم عہدِ رسالت میں اکثر صحابہ نے حفظ بھی کر لیا تھا اور کھجور کے پتوں، چمڑے کے ٹکڑوں پر متفرق طور پر لکھ بھی لیا گیا تھا۔ لیکن جنگ یمامہ میں جب بہت سے حفاظ صحابہ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر جنگوں میں حفاظِ قرآن کی شہادت کی یہی رفتار رہی تو کوئی حافظِ قرآن باقی نہ رہے گا۔ اس کا ذکر انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت صدیق اکبرؓ سے کیا۔ باہمی مشورہ کے بعد قرآن کریم کو یکجا جمع کرنے کا اہم کام حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا گیا۔ اس طرح فاروق اعظم کے تدبر نے قرآن کو ہمیشہ کے لئے تحریف وتبدل سے محفوظ کر دیا۔

روایتِ حدیث میں سخت احتیاط

احادیث کے متعلق بھی خلافتِ راشدہ میں سخت اہتمام تھا۔ تاکہ کوئی منافق اپنی فطری بدباطنی یا کوئی نومسلم اپنی کم علمی اور ناواقفی کے باعث غلط بات حضورؐ کی طرف منسوب نہ کر دے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات صحابہؓ کبار سے بھی سختی سے احادیث کی صحت کے بارے میں باز پرس کی جاتی۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور اپنے پوتے کے ورثے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں دادی کا حصہ قرآن میں بھی نہیں پاتا اور نہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دادی کا حصہ کچھ مقرر فرمایا۔ پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ اُٹھے اور کہنے لگے مجھے معلوم ہے حضورؐ دادی کو چھٹا حصہ دیا کرتے۔ آپ نے دریافت کیا کوئی اور بھی ہے جس نے حضورؐ سے ایسا سُنا ہو۔ حضرت محمد بن مسلمہ اٹھے اور حضرت مغیرہ کی تصدیق کی۔ تب صدیق اکبرؓ نے حضورؐ کے حکم کے مطابق اس عورت کو اس کے پوتے کا ورثہ دیا۔

۲۔ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فاروق اعظم کو باہر سے تین دفعہ سلام کیا لیکن جواب نہ ملا اور آپ واپس لوٹ آئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں بلوا بھیجا اور لوٹ جانے کی وجہ پوچھی۔ ابوموسیٰؓ نے جواب دیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص تین دفعہ سلام کہے اور اسے صاحبِ خانہ اندر آنے کی اجازت نہ دے تو وہ خواہ مخواہ اندر جانے پر مصر نہ ہو بلکہ واپس لوٹ جائے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو اس حدیث کی صحت پر گواہ پیش کرو ورنہ میں تمہاری خبر لوں گا۔ وہ صحابہ کے پاس واپس گئے تو ان کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں صحابہ نے

وجہ پوچھی تو سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ صحابہ نے کہا کہ ہم نے بھی حضور سے یہ حدیث سنی ہے۔ چنانچہ ایک شخص ان کے ساتھ گیا اور حضرت عمرؓ کے سامنے ابوموسیٰ اشعریؓ کی تصدیق کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمادی۔ قال عمر انی لم اتھمک ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے ابوموسیٰ میرا ارادہ تمہیں متہم کرنے کا نہ تھا لیکن میں نے اس خوف سے اتنی سختی کی تاکہ لوگ بے سروپا باتیں حضورؐ کی طرف منسوب نہ کرنے لگیں۔

اس قسم کی بہت سی دیگر روایات کتب احادیث میں موجود ہیں۔ خلفائے راشدین کثرت روایت سے لوگوں کو منع بھی فرمایا کرتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے اگر کوئی ایسی حدیث بیان کی جاتی جس کا آپ کو علم نہ ہوتا تو آپ راوی سے قسم لیتے۔ یہ ساری تدابیر اس لئے عمل میں لائی جاتیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ دیگر اقوال کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لیکن ان احتیاطی تدابیر سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ خلفاء کو احادیث کی صحت کے متعلق یقین نہ تھا۔ یا وہ احادیث پر عمل سے گریز کرنا چاہتے تھے افتراء محض اور بہتانِ صریح ہے۔ ان کی تو ساری زندگیاں اطاعتِ رسولِ کریمؐ میں بسر ہوئیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبۂ عام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک تصریح فرمادی۔

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم[1]

[1] تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۶۰۔

ترجمہ: جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرتے رہو۔ اور جب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ کریمؐ کی نافرمانی کرنے لگوں تو اس وقت تم میری اطاعت کے پابند نہیں ہو۔

اس سے بیّن اور روشن دلیل اور کیا ہوگی؟ حضرتِ صدیق جن کی خاکِ راہ سے دامنِ اقبال پھولوں سے بھر جاتا ہے اور خواب میں جن کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد حکیم الامت علیہ الرحمۃ بایں الفاظ خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے ؎

گفتمش اے خاصۂ خاصانِ عشق — عشق تو سر مطلعِ دیوانِ عشق
پختہ از دستت اساس کارِ ما — چارۂ فرما پئے آزارِ ما

وہ تو خلیفۃ المسلمین ہونے کے بعد اپنی اطاعت کو اطاعتِ رسولؐ سے مشروط کرتے ہیں۔ ان سے بہتر اور کون ہے جس کے لئے ہم اپنے نبی پاک کی سنت کو ترک کرکے اس کے احکام کی پابندی کریں اور اسے ہی قرآن فہمی کا تقاضا سمجھیں، کیا یہ حضرات حضرت صدیقؓ سے بھی زیادہ قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں؟

عہدِ فاروقی میں تعلیمِ سُنّت کا انتظام

عہدِ فاروقی میں تو احادیثِ نبوی کی نشر و اشاعت کا اس قدر اہتمام کیا گیا جس کے لئے ساری امت ان کی شرمندۂ احسان ہے۔ مملکتِ اسلامی کے گوشہ گوشہ میں حدیث کی تعلیم کیلئے ایسے صحابہ کو روانہ کیا جن کی پختگی سیرت اور بلندیٔ کردار کے علاوہ ان کی جلالتِ علمی تمام صحابہ میں مسلّم تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ازالۃ الخفا میں تحریر فرماتے ہیں:

چنانکہ فاروقِ اعظمؓ عبداللہ بن مسعودؓ را با جمعے بکوفہ فرستاد و مغفل بن یسار و عبداللہ بن مغفل و عمران بن حصین را بہ بصرہ و عبادہ بن صامت و ابو درداء را بشام و بہ معاویہ بن سفیان کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیثِ ایشاں تجاوز نہ کند۔

ترجمہ: قرآن و سنت کی تعلیم کے لئے حضرت فاروقِ اعظمؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ بھیجا اور مقفل بن یسار، وعبداللہ بن مغفل وعمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ بن صامت اور ابو درداء کو شام بھیجا اور امیر معاویہؓ کو جو اس وقت شام کے گورنر تھے۔ سخت تاکیدی حکم لکھا کہ یہ حضرات جو احادیث بیان کریں ان سے ہرگز تجاوز نہ کیا جائے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

حضرت عمرؓ نے اہلِ کوفہ کو ایک خط بھیجا جس میں تحریر کیا۔

انی قد بعثت الیکم عمار بن یاسر امیرا وعبداللہ بن مسعود معلما و وزیرا وھما من النجباء من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ومن اھل بدر فاقتدوا بھما واسمعوا وقد آثرتکم بعبداللہ بن مسعود علی نفسی۔[1]

ترجمہ: میں تمہاری طرف عمار بن یاسرؓ کو امیر بنا کر اور ابن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں اور یہ دونوں حضور کریمؐ کے بزرگ ترین صحابہ میں سے ہیں اور بدری ہیں۔ ان کی پیروی کرو اور ان کا حکم مانو۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو تمہاری طرف بھیج کر میں نے تمہیں اپنے نفس پر بھی ترجیح دی ہے۔

علامہ خضریؒ نے تاریخ التشریع الاسلامی میں مذکورہ بالا عبارت نقل

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی۔

کرنے کے بعد لکھا ہے۔

وقد قام فی الکوفة یاخذ منه اهلها حدیث رسول الله صلی الله علیه وهو معلمهم وقاضیهم۔

یعنی اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ مدت تک کوفہ میں قیام پذیر رہے اور وہاں کے باشندے ان سے احادیثِ نبوی سیکھتے رہے۔ وہ اہلِ کوفہ کے استاد بھی تھے اور قاضی بھی۔

حضرتِ فاروقؓ نے جب بصرہ کی امارت پر حضرت ابوموسی الاشعریؓ کو مقرر کیا اور وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے اپنے آنے کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کی۔

بعثنی الیکم عمر لاُعلمکم کتاب ربکم وسنة نبیکم۔[1]

مجھے حضرت عمرؓ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم کو میں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کی تعلیم دوں۔

اس کے علاوہ حضرتِ عمرؓ جب کبھی صوبوں کے حکام اور قضاۃ اور عساکرِ اسلامیہ کے قائدوں کو خط لکھتے تو انہیں کتاب اور سنتِ نبوی پر کاربند رہنے کی سخت تاکید فرماتے۔ آپ کا ایک تاریخی خط ہے جو آپ نے حضرت ابوموسی الاشعریؓ کو ارسال کیا۔ اس میں قاضی کے فرائض اور مجلسِ قضا کے آداب کو جس حسن و خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے اگر اسے اسلام کا بدترین دشمن بھی پڑھے تو جھوم جائے دیگر اُمور کے علاوہ آپ نے انہیں یہ بھی تحریر فرمایا:۔

ثم الفهم الفهم فیما ادلی الیك مما ورد علیك مما لیس فی قران ولا سنة ثم قایس الامور عند ذلك۔[2]

ترجمہ:۔ ان واقعات کا جن کے لئے تمھیں کوئی حکم قرآن اور سنت میں نہ ملے فیصلہ

۱؎ الدارمی۔ ۲؎ اعلام الموقعین لابن قیم ج ۱ ص ۷۲۔

کرنے کے لئے عقل اور سمجھ سے کام لو اور ایک چیز کو دوسری پر قیاس کیا کرو۔

آپ کا ایک اور مکتوب ہے جو قاضی شریح کو روانہ کیا گیا۔ اس میں آپ ان کے لئے ایک منہاج مقرر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اذا اتاك امر فاقض بما فی کتاب الله فان اتاك مالیس فی کتاب الله فاقض بما سن فیه رسول الله صلی الله علیه وسلم۔[1]

ترجمہ: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق کرو اور اگر کوئی ایسا واقعہ درپیش ہو جس کا حکم قرآن میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق اس کا فیصلہ کرو۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ اپنے عہدِ خلافت میں جب حج کرنے کے لئے گئے تو مملکت اسلامیہ کے تمام والیوں کو حکم بھیجا کہ وہ بھی حج کے موقعہ پر حاضر ہوں جب وہ سب جمع ہو گئے تو اس وقت حضرت عمرؓ نے ایک تقریر فرمائی۔

قال ایها الناس! انی ما ارسل الیکم عمالا لیضربوا ابشارکم ولا لیأخذوا اموالکم وانما ارسلهم الیکم لیعلموکم دینکم وسنة نبیکم۔ فمن فعل به شیٔ سوی ذلك فلیرفعه الی فوالذی نفس عمر بیده لاقصنه منه۔[2]

ترجمہ:۔ آپ نے کہا:۔ اے لوگو! میں نے تمہاری طرف جو حکام بھیجے ہیں وہ اس لئے نہیں بھیجے تاکہ وہ تمہیں زدوکوب کریں اور تمہارے اموال تم سے چھینیں۔ میں نے انہیں صرف اس لئے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کریم کی سنت سکھائیں۔ حکام میں سے اگر کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہو تو پیش کرو اس ذاتِ پاک کی قسم جس کے دستِ

۱؎ الموافقات للامام الشاطبی ج ۴ ص ۷۔ ۲؎ تاریخ ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۰ و کتاب الخراج ص ۱۶۔

قدرت میں عمر کی جان ہے۔ میں اس حاکم سے قصاص لئے بغیر نہیں رہوں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے محبوب و کریم رسول کی سنت کی نشرواشاعت اور تمام قلمرو اسلامی میں اس پر سختی سے عمل کرانے کی جو مساعی کیں یہ اس کا نہایت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔ لیکن کم از کم اس سے یہ حقیقت تو ہویدا ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو یقین تھا کہ رسولِ اکرمؐ کی اطاعت امّت پر قیامت تک فرض ہے اور اسی میں ان کی ترقی، عزت اور ہیبت کا راز پنہاں ہے۔ اسی لئے تو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں جلیل القدر صحابہ کو بھیجا کہ وہ لوگوں کو ان کے رسول کی سنت کی تعلیم دیں اور حکام کو بار بار اتباعِ سنت کے لئے مکتوبات روانہ کئے۔

منکرینِ سنت فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی اطاعت فقط حضورؐ کی ظاہری زندگی تک فرض تھی۔ اس کے بعد امت پر حضورؐ کی اطاعت ضروری نہیں۔ حیرت ہے کہ اس امر کی طرف نہ تو قرآن نے اشارہ کیا، نہ اللہ کے رسول نے اور یہ راز نہ تو خلفاءِ راشدین کو سمجھ میں آیا اور نہ دوسرے صحابہ کرام کو جنہوں نے عرصۂ دراز نبی اکرمؐ کی صحبت میں بسر کیا اور جن کی موجودگی میں سارا قرآن نازل ہوا۔ آخر یہ رازِ سربستہ چودہ سو سال کے بعد ان حضرات پر کیسے منکشف ہو گیا۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝

کیا حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کو کثرتِ روایت کی وجہ سے قید کیا

منکرینِ سنت صحیح اور مستند احادیث کو تو ماننے سے گریزاں ہیں۔ لیکن اگر کہیں کوئی غلط اور موضوع روایت ایسی ملتی ہے جس سے ان کے مسلک کو کچھ تقویت پہنچتی ہو تو اسے اس وثوق سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے انہوں نے اتنی صدیوں کی مسافت طے کر کے اس روایت کو خود اپنے کانوں سے سُنا ہو۔ یہ انسان کے ضعف اور اپنی

اہواء سے بہت جلد مغلوب ہونے کی کھلی علامت ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف وہ ایسی بے سروپا باتیں منسوب کرتے ہیں جنہیں سن کر انسان تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو احادیث بیان کرنے سے روکا کرتے تھے اور جو لوگ احادیث کو کثرت سے بیان کرتے ان کو آپ نے قید بھی کر دیا تھا ـــــ آئیے ذرا ان کے اس دعویٰ کا بھی سُراغ لگائیں، کہ اس میں کہاں تک صحت ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو روایت حدیث سے منع کر دیا تھا۔ حالانکہ اس بات کی ان کے پاس کوئی قابلِ اعتبار سند نہیں۔ اس کے برعکس صحیح روایت سے یہ ثابت ہے۔

روی ان عمر قال لابی هريرة حين بدأ يكثر من الحديث أكنت معنا حين كان صلی اللہ علیہ وسلم فی مکان کذا؟ قال نعم سمعته صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار۔" فقال له عمر اما اذا ذكرت ذٰلك فاذهب فحدث[1]

ترجمہ:۔ جب حضرت ابوہریرہؓ نے کثرت سے احادیث بیان کرنی شروع کیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کیا تم ہمارے ساتھ تھے جب رحمت عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم فلاں مکان میں تشریف فرما تھے؟ تو ابوہریرہؓ نے جواب دیا ہاں میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سُنا "کہ جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ بولا اس نے اپنا ٹھکانہ آگ میں بنایا۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا جب تجھے حضورؐ کا یہ ارشاد یاد ہے تو جاؤ لوگوں کو احادیثِ نبوی سناؤ۔ (کیونکہ جسے یہ فرمانِ نبوی یاد ہو وہ کبھی جھوٹی حدیث بیان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا)۔

[1] کتاب الاحکام لابن حزم ج ۲ ص ۱۳۹۔

دوسرا الزام جو فاروقِ اعظم پر لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

ان عمر رضی اللہ عنہ حبس ثلاثۃ من کبار الصحابۃ
لاکثارھم الحدیث وھم ابن مسعود وابو درداء وابوذر۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین بزرگ صحابہ ابن مسعودؓ وابو درداءؓ اور ابوذرؓ کو نظر بند کر دیا کیونکہ وہ احادیث بہت کثرت سے بیان کرتے تھے۔

اس روایت کو دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ روایت بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر کثرتِ روایتِ احادیث سے ان کو قید کر دیا تو اور صحابہ کرام جو ان سے بھی زیادہ احادیث روایت کرتے تھے مثلاً ابوہریرہؓ، ان کے اپنے صاحبزادے عبداللہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرھم ان کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ دوسرا یہ کہ ابوذرؓ کا شمار تو ان صحابہ میں ہے ہی نہیں جن سے احادیث بہت کثرت سے مروی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعودؓ وابودرداءؓ کو تو حضرت عمرؓ نے عراق اور شام میں روانہ کیا تاکہ لوگوں کو احادیث نبوی سکھائیں پھر انہوں نے کون سا قصور کیا کہ ان کو قید کر دیا گیا۔ یہ تمام امور حضرت فاروق ایسی جلیل القدر اور رفیع المرتبت ہستی سے بالکل بعید ہیں۔ جس کو آپ کی زندگی کے احوال سے معمولی بھی آگاہی ہے وہ بلا ادنیٰ تامل فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ روایت جس کا سہارا ان حضرات نے لیا ہے، بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اگر آپ اس پر اکتفا نہیں کرتے تو ایک بے لاگ نقاد کا قول سنئے:۔

(قال ابن حزم) ان الخبر فی نفسہ ظاھر الکذب والتولید۔ (کتاب الاحکام لابن حزم ج۲ ص۱۳۹)

ابن حزم کہتے ہیں کہ اس خبر کا کاذب اور موضوع ہونا بالکل ظاہر ہے۔

حصولِ حدیث کے لئے عام صحابہ کا شوق

صحابہ کرام کو حصول حدیث کا اس قدر اور اس کی صحت کا اس قدر اہتمام تھا

کہ شائقینِ علم میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر دو واقعے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ جنہیں مدینہ طیبہ میں شہنشاہِ دوسراؐ کی پہلی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا آپ نے ایک حدیث اپنے محبوبِ کریم سے سنی تھی۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس حدیث کے صحیح الفاظ میں کچھ اشتباہ سا ہو گیا، اس وقت ان کے علاوہ فقط ایک اور صحابی عقبہ بن عامرؓ زندہ تھے جنہوں نے یہ حدیث سرورِ کائنات سے سنی تھی اور وہ ان دنوں مصر میں تھے۔ حضرت ابو ایوبؓ عازم مصر ہوئے لق و دق صحراؤں اور کٹھن منزلوں کو طے کرتے ایک ماہ بعد مصر پہنچے۔ انہیں حضرت عقبہؓ کی جائے رہائش کا پتہ نہ تھا اس لئے پہلے مسلمہ بن مخلد انصاریؓ امیرِ مصر کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں پہنچتے ہی ان سے کہا کہ میرے ساتھ ایک آدمی بھیجو جو مجھے عقبہ کے مکان تک پہنچا دے۔ چنانچہ ان کے ہاں پہنچے۔ انہیں خبر ہوئی تو وہ دوڑے دوڑے آئے اور فرطِ اشتیاق سے گلے لگا لیا اور تشریف آوری کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابو ایوبؓ نے جواب دیا کہ مومن کی پردہ داری اور عیب پوشی کے متعلق جو حدیث تم نے حضورؐ سے سُنی ہے فقط وہ پوچھنے آیا ہوں۔ عقبہؓ کہنے لگے:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من ستر
مؤمنا فی الدنیا علی عورۃ سترہ اللہ یوم القیٰمۃ۔

ترجمہ:۔ میں نے حضورؐ کو فرماتے سنا کہ جس نے دنیا میں کسی مومن کے عیب کو چھپایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کو چھپا دے گا۔

حضرت ابو ایوبؓ نے سن کر تصدیق کی اور فرمایا مجھے اس حدیث کا پہلے بھی علم تھا۔ لیکن مجھے اس کے الفاظ میں وہم سا ہو گیا تھا اور میں نے

گوارا نہ کیا کہ تحقیق سے پہلے لوگوں کو یہ حدیث سناؤں۔ سُبحان اللہ! کمال احتیاط
کا کیا انوکھا نمونہ ہے۔ ایک حدیث میں ذرا سا وہم ہو گیا فقط اس کے ازالہ
کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کیا اور حدیث سننے کے بعد اسی روز اپنی سواری پر
سوار ہو کر مراجعت فرمائے دیارِ محبوب ہوئے۔ (عینی۔ فتح الباری)

۲۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کو پتہ چلا کہ ایک شخص کے پاس حضورؐ کی
حدیث ہے اور وہ آج کل شام میں مقیم ہے۔ اسی وقت ایک اونٹ خریدا
اور شام کی طرف چل پڑے۔ پورے ایک مہینہ کے سفر کے بعد شام پہنچے اور
اس صحابی کے مکان پر جن کا نام عبداللہ بن انیسؓ تھا گئے۔ حضرت جابرؓ کا نام سنتے
ہی باہر آئے اور ان سے بغل گیر ہوئے۔ حضرت جابرؓ کہنے لگے کہ میں نے سُنا ہے کہ
تمہارے پاس حضور کریمؐ کی ایک حدیث ہے جو میں نے نہیں سُنی اور مجھے اندیشہ
ہوا کہ کہیں اس کے سننے سے پہلے ہی داعیٔ اجل کو لبیک نہ کہنا پڑے۔ اس لئے
جلدی جلدی آیا ہوں۔ مجھے وہ حدیث سُنائیے وہ کہنے لگے میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا۔

یحشر اللہ الناس یوم القیٰمۃ فینادیھم بصوت یسمعہ من
بعد کما یسمعہ من قرب انا الملک الدیان لا ینبغی
لاھل الجنۃ ان یدخل الجنۃ وواحد من اھل النار یطلبہ
بمظلمۃ حتی یقتصہ منہ حتی اللطمۃ۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
کے چچا زاد بھائی تھے اور ہر وقت بارگاہِ رسالت میں مصروفِ خدمت نظر آتے حضورؐ
نے بارہا ان کے لئے یہ دُعا فرمائی اللھم فقھہ فی الدین۔ اے اللہ اسے دین
کی سمجھ عطا فرما۔ حضورؐ کے وصال کے وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی۔ حضرت عبداللہؓ

کہتے ہیں کہ میں نے ایک انصاری سے کہا، کہ حضورؐ تو داغِ مفارقت دے گئے۔
لیکن ابھی صحابہ کرام موجود ہیں انہیں سے کسبِ علم کریں۔ وہ بولے میاں رہنے
دو اتنے اکابر صحابہ کی موجودگی میں کسے کیا پڑی ہے کہ ہم سے آکر مسائل دریافت
کرے۔ میں نے ان کی اس نصیحت پر کان نہ دھرے اور حصولِ علم پر کمر ہمت
باندھ لی۔ جس کے متعلق مجھے علم ہوتا کہ اس نے کوئی حدیث حضور انور علیہ الصلوٰۃ
والسلام سے سنی ہے تو اس کے پاس جا کر وہ حدیث سنتا اور یاد کر لیتا۔ بعض
لوگوں کے پاس جاتا تو وہ سو رہے ہوتے۔ اپنی چادر ان کی چوکھٹ پر رکھ کر
بیٹھ رہتا اور بسا اوقات گرد و غبار سے میرا چہرہ اور جسم اَٹ جاتا۔ جس وقت
وہ بیدار ہوتے اس وقت ان سے وہ حدیث سنتا۔ وہ حضرات کہتے بھی کہ آپ
تو محبوبِ خُدا کے برادرِ عم زاد ہیں۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھائی
ہمیں یاد کیا ہوتا ہم آپ کے گھر آجاتے۔ لیکن میں کہتا کہ میں علم حاصل کرنے والا
ہوں اس لئے میں ہی حاضر ہونے کا زیادہ مستحق ہوں۔ بعض حضرات دریافت کرتے
کہ کب سے بیٹھے ہو میں کہتا بہت دیر سے۔ تو وہ برہم ہو کر کہتے کہ آپ نے اپنی آمد
کی اطلاع اسی وقت کیوں نہ بھجوا دی تا کہ ہم اسی وقت آجاتے اور آپ کو اتنا
انتظار نہ کرنا پڑتا۔ میں کہتا میرا دل نہ چاہا کہ آپ میری وجہ سے اپنی ضروریات سے فراغت
پانے سے پہلے ہی آجائیں۔ اسی جانفشانی اور عرق ریزی کا ثمرہ تھا کہ حضرت عمر رضی
اللہ تعالیٰ عنہ ان کی صغر سنی کے باوجود انہیں ممتاز علماء کی صف میں جگہ دیتے۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

احادیث کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی وجہ

احادیثِ نبوی کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کے ارشادات

صحابہ کے لئے فقط متبرک جملے نہ تھے جنہیں صرف تبرک کے لئے یاد کر لیا جاتا بلکہ ان کی زندگی کا ہر پہلو انہیں ارشادات کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کے دل کے ان لطیف احساسات سے لے کر جنہیں پابندِ الفاظ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی طبعی خواہشات تک سب کے سب سنتِ مصطفوی کے پابند تھے۔ ان کی خلوتوں کا سوز و گداز اور ان کی جلوتوں کا خروش عمل ان کی شب بیداریاں اور دن کے قیلولے سب فرمانِ نبوی کے تابع تھے اور جو قول فعل سے ہر وقت ہمکنار رہے وہ بھی کبھی فراموش ہو سکتا ہے؟ اور وہ فرمان جس کے متعلق یقین ہو کہ اسی کی تعمیل میں ہماری فلاحِ دارین ہے اس کی یاد کے نقوش بھی کبھی دھندلے پڑ سکتے ہیں؟ صحابہ کرام کو جو عشق تھا۔ محبوبِ خدا سے جو جنون تھا۔ اس کے ہر ارشاد کی تعمیل کا جو سودا تھا حصولِ علم کا۔ جو جذبہ تھا تبلیغ دینِ قیم کا۔ اس کے پیشِ نظر ایک اجنبی بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ صحابہؓ کرام نے حضورؐ کا ایک فرمان بھی فراموش نہ ہونے دیا ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت بھی بخوبی واضح ہو گئی کہ صحابہ کرام کا یہ ایمان تھا کہ حضورؐ کے بعد بھی حضورؐ کا ہر فرمان حجت ہے اور واجب التسلیم۔ ورنہ وہ اس کے حصول اور حفاظت کا اتنا اہتمام نہ کرتے اور فاروقِ اعظمؓ جیسا مدبّر سنّت کی تعلیم و اشاعت کے لئے اتنے بڑے بڑے علماء و صحابہ کو مملکتِ اسلامی کے مختلف مرکزی مقامات پر نہ بھیجتا۔ صحابہ کرام نے احادیثِ نبوی کو صرف اُن کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس لئے کہ قیامت تک آنے والی نسلیں اس چراغِ ہدایت کی روشنی میں زندگی کی دشوار گزار گھاٹیاں طے کر کے شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہوں۔

فصل سوم

عہدِ تابعین

کتنا خوش نصیب ہے وہ باپ جسے ایک سعادت مند فرزند عطا ہو اور کتنا بلند اقبال ہے وہ استاد جسے ایک ہونہار شاگرد مل جائے۔ صحابہ کرام اس لحاظ سے بہت ہی نیک بخت تھے کہ انہیں اولاد ملی تو ایسی قابل جس نے اپنے اسلاف کے ورثۂ علم کی خوب قدر کی۔ اور شاگرد ملے تو ایسے بیدار مغز کہ انہوں نے اپنے اساتذہ کے فیضِ صحبت کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

تابعی کی تعریف

اصطلاحِ علم حدیث میں 'تابعی' اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ دیدار تو میسّر نہ ہوا ہو۔ لیکن صحابہ کرام کے فیضِ صحبت کی سعادت نصیب ہوئی ہو۔

تابعین کے ابتدائی دَور میں بھی احادیث کے متعلق وہی اہتمام رہا۔ ہر شہر میں درس و تدریس کے حلقے قائم تھے اور علم و دانش، دیانت و تقویٰ کے اعتبار سے شہرہ آفاق ہستیاں احادیثِ نبوی کی تعلیم میں مشغول رہتیں اور اطراف و اکناف سے تشنگانِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث سیکھتے۔ مثال کے طور پر مملکتِ اسلامیہ کے چند مرکزی شہروں میں حدیثِ پاک کی تدریس میں مشغول رہنے والے چند تابعین کے احوال[1] مختصراً ذکر کرتا ہوں۔

---

[1] تابعین اور دیگر محدثین کے جو احوال و واقعات یہاں درج کئے گئے ہیں۔ ان کے لئے میں نے مندرجہ ذیل مستند مراجع سے استفادہ کیا ہے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ للامام الذہبی (۲) وفیات الاعیان لابن خلکان (۳) تہذیب الاسماء للامام النووی۔
(۴) البدایۃ والنہایۃ للامام ابن کثیر (۵) حلیۃ الاولیاء للمحدث الکبیر ابی نعیم (۶) مقدمۃ اشعۃ اللمعات۔
(۷) تاریخ بغداد للخطیب البغدادی۔

المدینۃ المنورۃ

خوش تر آں شہرے کہ دروے دلبر است

(۱) سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ان کی ولادت خلافت فاروقی کے دوسرے سال میں ہوئی۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو خطبہ دیتے ہوئے سُنا۔ علمِ حدیث حضرات عثمان زید بن ثابت، عائشہ، سعد ابی ہریرہ رضی اللہ عنہم سے سیکھا۔ بڑے بڑے فضلاءِ عصر کو ان کی جلالت علمی کا اعتراف تھا۔ ابن عمرؓ انہیں مفتیوں میں شمار کرتے تھے۔ قتادہؓ کہتے ہیں میں نے سعید بن المسیب سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا۔ زہری اور مکحول کی بھی یہی رائے تھی۔ علی بن مدینی کہتے ہیں تابعین میں سے وسعتِ علم میں سعید سے زیادہ میں کسی کو نہیں جانتا۔ میرے نزدیک وہ بزرگ ترین تابعی ہیں۔

ریاضت و عبادت کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور عمر میں چالیس حج کئے۔ جماعت کے اس قدر پابند تھے کہ پچاس سال تک تکبیرِ اُولیٰ قضا نہیں ہوئی اور نہ ہی ان سے پہلے کوئی مسجد میں گیا۔ ایک دفعہ ان کی آنکھیں دُکھنے لگیں کسی حکیم نے کہا کہ اگر عقیق (ایک جگہ کا نام ہے) چلے جاؤ تو وہاں کے سبزہ زاروں کی طرف دیکھنے سے اور تازہ اور ستھری ہوا سے آنکھیں درست ہو جائیں گی۔ فرمانے لگے عشا و صبح کی نماز کا کیا کروں۔ یعنی وہ جماعت سے ادا نہ کر سکوں گا اور ترکِ سنت کا مرتکب ہوں گا۔

اپنا اتباعِ سنتِ نبوی کا یہ جذبہ تھا اور اس پر غیر متزلزل استقامت کی یہ کیفیت تھی اور دوسرا جو حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کی خلاف ورزی کرتا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ابن حرملہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن مسیبؒ

کو کبھی کسی کو بُرا بھلا کہتے نہیں سُنا۔ پہلی دفعہ میں نے ان کو یہ کہتے سُنا کہ خدا فلاں کو ہلاک کرے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیصلہ کے خلاف حکم دیا۔ حدیث بیان کرتے وقت ادب و احترام کو پورا ملحوظ رکھتے۔ ایک دفعہ آپ بیمار تھے اور چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ کہ مطلب بن خنطب ان کے ہاں آئے اور ایک حدیث کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ سعید فرمانے لگے مجھے بٹھا دو! مجھے بٹھا دو میں اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں کہ لیٹے لیٹے حضور نبی اکرم کی حدیث بیان کروں۔

استغناء اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی بادشاہ کا تحفہ قبول نہیں کیا ان کے پاس چار سو دینار تھے ان سے زیتون کی تجارت کیا کرتے اور جو کچھ نفع ہوتا اس سے گزر اوقات کرتے۔

ایمان انسان کو کس قدر جری اور نڈر کر دیتا ہے؟ آپ اس کی زندہ مثال تھے ہمیشہ خلفائے بنی امیہ کے فسق و فجور اور مظالم پر صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ عبدالملک نے ان کو اپنا زیبِ فتراک بنانے کے لئے طرح طرح کے حیلے کئے لیکن یہ شاہین زیرِ دام نہ آیا۔ ہر دام کو جھٹک دینے کے بعد یہی کہا کرتے

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

ایک دفعہ عبدالملک نے ان کی خدمت میں تیس ہزار روپے سے زائد روپیہ ارسال کیا آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا۔

لاحاجۃ لی فیھا ولا فی بنی مروان۔

یعنی نہ مجھے اس روپیہ کی ضرورت ہے اور نہ بنی مروان کی۔

ان کی ایک صاحبزادی تھیں جو حُسنِ سیرت و صورت میں رشکِ روزگار

تھیں قرآن کریم کی حافظہ اور علوم سنت کی ماہرہ تھیں۔ عبدالملک نے اپنے ولی عہد ولید کے لئے رشتہ طلب کیا لیکن آپ نے اس کی اس درخواست کو نامنظور فرمادیا اور ابووداعہ جو بالکل تہیدست تھے لیکن متقی اور پرہیزگار تھے ان کو اپنی دامادی کا فخر بخشا۔

عبدالملک نے جب ولید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور تمام لوگوں سے اس کے متعلق بیعت لے لی اور حضرت سعید بن مسیب اپنے انکار پر مُصر رہے۔ تو عبدالملک نے مدینہ طیبہ کے والی کی طرف حکم لکھا کہ جس طرح بھی ہوسکے ان سے ولید کے لئے بیعت لے اور اگر راضی نہ ہوں تو ان کو قتل کی دھمکی دے۔ اس کی اطلاع جب سلیمان بن یسار وعروہ بن زبیر اور سالم بن عبداللہ کو ہوئی تو وہ اُن کے پاس آئے اور ان کو آگاہ کیا اور اس مشکل سے بچنے کے لئے ان کے سامنے مختلف تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے ان سے کہا کہ جب والی خط لے کر آپ کے پاس آئے اور آپ کو سنائے تو آپ خاموشی اختیار فرمائیے اور ہاں یا نہیں کچھ نہ کہیے۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے تو لوگ یہ اندازہ لگاسکیں گے کہ سعید نے بیعت کرلی اور میں بیعت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ انہوں نے دوسری تجویز یہ پیش کی کہ آپ چند روز گھر میں اقامت فرمائیے اور باہر نہ نکلئے تاکہ یہ جوش ختم ہوجائے۔ آپ نے فرمایا:۔

فانا اسمع الاذان فوق اذنی حی علی الصلوٰۃ
حی علی الصلوٰۃ ما انا بفاعل ذٰلک۔

ترجمہ:۔ میں جب اذان کا یہ جملہ سنوں گا کہ حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ کہ آؤ نماز کی طرف، آؤ نماز کی طرف، تو مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا کہ میں اس کے باوجود گھر میں بیٹھا رہوں۔

آخری تجویز یہ تھی کہ آپ اپنی نشستگاہ بدل لیں اور والی جب آپ کو اپنی مقررہ جگہ پر نہ پائے گا تو اسی پر قانع ہوجائے گا۔ یہ سن کر مؤمن کی زبان سے ایک جملہ نکلا جس سے فضا میں سنسنی پھیل گئی۔

آفرقا من مخلوق۔

اللہ کا بندہ ہوکر مخلوق سے ڈروں مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ غالب مرحوم نے کیا خوب تصویر کشی کی ہے ؎

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

چنانچہ ظہر کی نماز کے بعد انہیں والی نے بلایا اور ولید کے لئے بیعت طلب کی تو اس مجسمۂ حق وصداقت نے صاف انکار کردیا۔ اس نے قتل کی دھمکی دی لیکن بے سود۔ آخر آپ کو پچاس کوڑے لگائے گئے اور شہر کے کوچہ وبازار میں انہیں پھرایا گیا لیکن جنونِ عشق کے یہ انداز نہ چھٹے۔

اس مؤمن پاکباز اور مردِ صداقت شعار نے اپنی قوت وتوانائی کا آخری قطرہ تک علمِ نبوت کی شمع کو فروزاں رکھنے کے لئے صرف کردیا اور اسی خدمت گزاری میں سنہ ۱۰۵ھ میں اپنی جان، جان آفریں کی نذر کردی۔ رحمہُ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

(۲) عروہ بن زبیر بن عوام قرشی اسدی

مدینہ طیبہ کے علماءِ اعلام میں شمار ہوتے ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ انہیں سے زیادہ علم سیکھا ان کے علاوہ حضرت زید بن ثابت، اسامہ بن زید، سعید بن زید، حکیم بن حزام اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ ان کے شاگردوں میں ان کے لڑکے ہشام، محمد، عثمان، یحییٰ عبداللہ کا نام اور امام زہری ابوالزناد، ابن المنکدر، صالح بن کیسان کے اسماء

بہت مشہور ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں میں نے انہیں بحرِ بیکراں پایا۔ ان کے بیٹے
ہشام سے مروی ہے کہ ان کے والد مکرم عروہ ہمیشہ کے روزہ دار تھے۔ دن کو قرآن
کریم کا چوتھا حصّہ تلاوت کرتے اور شب کی تنہائیوں میں نماز تہجد ادا کرتے وقت
پھر اس کی تلاوت سے لذّت اندوز ہوتے۔

ایک دفعہ ان کے پاؤں میں ایک پھوڑا (آکلہ) نکل آیا۔ طبیب نے کہا اگر اسے
کاٹیں گے نہیں تو سارا جسم خراب ہو جائے گا۔ کاٹنے سے پہلے آپ سے کہا گیا کہ
شراب پی لیجیے تاکہ درد کی اذیت نہ ہو۔ فرمانے لگے میں اس چیز کو استعمال نہیں
کروں گا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔ پھر انہیں کہا گیا کہ خواب آور دوائی (المرقد)
پی لیجیے کہنے لگے اگر نیند کی حالت میں آپ نے میرا پاؤں کاٹا تو شدّتِ الم میں
صبر کرنے کی لذّت سے محروم رہ جاؤں گا۔ پاؤں کا گوشت چھری سے اور ہڈی
آری سے کاٹی گئی۔ لیکن انہوں نے اف تک نہ کی۔ جب درد کا یہ عالم ہو کہ چھری
سے گوشت اور آری سے ہڈی کٹ رہی ہو۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی اس آزمائش
پر صبر کرنے میں جو لطف ہوتا ہے اسے کچھ وہی اولوالعزم ہستیاں محسوس کر سکتی ہیں۔
ہم تو ایسے واقعات پڑھ کر ہی کانپ اٹھتے ہیں۔

جب پاؤں کاٹ دیا گیا اور خون بند کرنے کے لئے گرم تیل میں اسے رکھا گیا تو
غشی طاری ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو اپنے کٹے ہوئے پاؤں کو ہاتھ میں لے کر فرمانے لگے۔

اما والذی حملنی علیك انه لیعلم انی ما مشیت بك الی معصیة۔

اس ذات پاک کی قسم جس نے مجھے آج تک تجھ پر اٹھائے رکھا۔ وہ جانتا ہے
کہ میں تیرے ساتھ گناہ کی طرف چل کر کبھی نہیں گیا۔[1]

آپ کا سال وفات ۹۴ھ ہے۔

[1] وفیات الاعیان لابن خلکان ج ۲ صفحہ ۴۲ (طبع نہضہ)

(۳) سالم بن عبداللہ بن امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم

آپ مدینہ طیبہ کے سات فقہاء میں سے ہیں۔ ان کا شمار تابعین کے چوٹی
کے علماء میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور دوسرے صحابہ سے احادیث
نبوی سنیں اور امام زہری اور نافع اور دیگر محدثین نے آپ سے علمِ احادیث
حاصل کیا۔

ایک دفعہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا کہ ان کی طرف
حضرت عمرؓ کے خطوط میں سے کوئی خط روانہ کریں۔ تو ان کی طرف یہ پند آمیز اور
ناصحانہ خط ارسال فرمایا۔

ترجمہ:۔ اے عمر! ان بادشاہوں کو یاد کر جن کی وہ آنکھیں جن سے وہ ہمیشہ لطف اندوز
ہوتے تھے پھٹ چکی ہیں اور ان کے وہ پیٹ جو کبھی سیر نہ ہوتے تھے پھٹ
چکے ہیں اور وہ مٹی کے ٹیلوں کے نیچے مردار پڑے ہیں اور اگر انہیں دفن نہ
کیا جاتا اور ان کے جسموں کو ہمارے مکانوں کے نزدیک ڈال دیا جاتا تو ان
کی عفونت سے ہمیں سخت اذیت پہنچتی۔

ہمیشہ اون کا لباس زیب تن ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا تمام کام
کرتے۔ آپ حج کے لئے گئے ہوئے تھے کہ سلیمان بن عبدالملک نے آپ کو
خانہ کعبہ میں دیکھا تو آپ سے کہنے لگا۔

سلنی حوائجك یعنی اپنی ضروریات کے لئے مجھ سے طلب کرو۔ میں
پوری کروں گا۔ فرمانے لگے۔

واللہ لا سألت فی بیت اللہ غیر اللہ۔

بخدا! میں اللہ کے گھر میں غیر اللہ سے سوال نہیں کیا کرتا۔

امام مالکؒ کہا کرتے کہ سالمؒ سے بڑھ کر زہد و تقویٰ اور میانہ روی میں

سلفِ صالحین کے ہم مثل اور کوئی نہیں۔ آپ دو درہم کا کپڑا پہنا کرتے تھے۔
آپ کا انتقال ماہ ذوالحجہ کے آخر میں سنہ ۱۰۶ھ میں مدینہ طیبہ میں ہوا۔

کوفہ

(۱) امام علقمہ بن قیس بن عبداللہؒ

انہوں نے علمِ حدیث حضرات عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود اور ابی درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سیکھا۔ یہ ابن مسعودؓ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے۔ ابن مسعودؓ خود ان کی وسعتِ علمی کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

مَا اَقْرَأُ شَیْئًا وَمَا اَعْلَمُ شَیْئًا اِلَّا وَعَلْقَمَۃُ یَقْرَؤُہٗ وَیَعْلَمُہٗ[1]۔

یعنی جو کچھ میں پڑھ سکتا ہوں اور جو کچھ میں جانتا ہوں علقمہ بھی اُسے پڑھ سکتا ہے اور جانتا ہے۔

قوم کی طرف سے انہیں فقیہ العراق کا معزز ترین خطاب ملا ہوا تھا۔ کئی صحابہ بھی ان سے آکر مسائل دریافت کیا کرتے۔ قناعت و سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ بکریوں کا ایک ریوڑ پال رکھا تھا۔ اسی پر گزر اوقات ہوتی تھی۔ اپنی بکریاں خود ہی دوہتے اور خود ہی انہیں گھاس ڈالتے۔ اپنے شاگردوں سے کبھی خدمتِ نفس کا کام نہیں لیا۔

علقمہ فرمایا کرتے احیاء العلم المذاکرۃ یعنی بار بار دُہرانا علم کو زندہ رکھتا ہے اکثر اپنے شاگردوں کو نصیحت کیا کرتے:

تذکروا الحدیث فان حیاتہ ذکرہ۔

حدیث کو بار بار دہرایا کرو، کیونکہ دہرانا ہی اس کی زندگی ہے۔

[1] تاریخ الفقہ الاسلامی للشیخ محمد علی السایس ص۸۲۔

اتنے علم وفضل اور فہم وذکاء کے مالک نے اپنی ساری عمر تدریسِ حدیث میں گزار دی۔ ان کے ہزارہا شاگرد تھے، جن میں ابراہیم نخعی، ابوالضحیٰ مسلم بن صبیح اور شعبی محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا انتقال سنہ ۶۲ھ میں ہوا۔

۲۔ مسروق بن الاجدع

یہ مجاہدِ اعظم عمرو بن معدی کرب کے بھانجے ہیں۔ انہوں نے حضرات عمر، علی، معاذ، ابن مسعود، ابیّ رضی اللہ عنہم ایسے کبار صحابہ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ اپنے اوصافِ حمیدہ کے باعث انہوں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک اتنی مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ حضرت صدیقہؓ نے انہیں متبنیٰ بنالیا۔ ان کے شاگرد امام شعبی ان کے شوقِ علم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ما علمت احدا کان اطلب للعلم منہ[1]۔

مجھے کوئی ایسا آدمی معلوم نہیں جس کے دل میں حصولِ علم کی تڑپ ان سے زیادہ ہو۔ شعبی کہتے ہیں کہ صرف ایک آیت کا معنی دریافت کرنے کے لئے کوفہ سے بصرہ کا سفر کیا، لیکن وہاں مقصد حاصل نہ ہوا۔ انہیں بتایا گیا کہ شام میں ایک فاضل ہے جو آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔ شوقِ علم کی بے قراریاں ملاحظہ ہوں، اسی ایک آیت کا معنی دریافت کرنے کے لئے بصرہ سے شام کا رُخ کیا۔

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ابواسحٰق کہتے ہیں کہ مسروق حج کو گئے۔ اثنائے حج میں اگر سوئے تو سجدہ میں سر رکھ کر ہی سوئے۔ ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ نماز پڑھتے پڑھتے ان کے پاؤں سُوج جاتے تھے۔ نماز شروع کرتے وقت اپنے اور گھر والوں کے درمیان پردہ لٹکا دیتے۔ پھر محویت کی یہ کیفیت طاری ہوتی کہ دُنیا ومافیہا کی خبر تک نہ رہتی۔

[1] تہذیب الاسماء للنووی ج ۲ ص ۸۸۔

آپ کا ایک مقولہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

كَفٰى بِالْمَرْءِ عِلْمًا اَنْ يَّخْشَى اللّٰهَ وَكَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَنْ يُّعْجَبَ بِعَمَلِهٖ

ترجمہ: انسان کے لئے اتنا علم کافی ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ سے ڈرنے لگے اور اسے (ڈبونے کے لئے) اتنی جہالت کافی ہے کہ وہ اپنے عمل پر مغرور ہو جائے۔

یہ بھی مدت العمر کوفہ میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ آپ کی وفات ۶۳ھ میں ہوئی۔

(۳) امام ابو عمرو النخعیؒ

یہ حضرت علقمہؒ مذکور کے بھتیجے ہیں۔ انہوں نے علمِ حدیث حضرات معاذ، ابن مسعود، حذیفہ، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر صحابۂ کبار اور اپنے چچا علقمہ سے حاصل کیا۔ نہایت عبادت گزار اور پرہیز گار تھے۔ اپنی عمر میں اسّی حج اور عمرے کئے اور ہر روز سات سو رکعت نفل پڑھا کرتے، ان کے اعمالِ حسنہ کے پیشِ نظر لوگ اُن کی زندگی میں ہی انہیں جنتی کہا کرتے۔

رمضان المبارک میں ہر دوسرے روز ختمِ قرآن کیا کرتے۔ صرف شام اور عشاء کے درمیان مختصر سے وقت میں سوتے، باقی ساری رات یادِ خدا میں بیت جاتی اور رمضان کے علاوہ ہر چھٹے روز ختمِ قرآن کیا کرتے۔

علقمہ بن مرثد کہتے ہیں کہ آٹھ تابعین نے زہد و ریاضت کی انتہاء کر دی انہیں میں سے نخعی بھی ہیں۔

جب وقتِ مرگ قریب آپہنچا تو بہت روئے۔ کسی نے کہا یہ گھبراہٹ کیسی؟ کہنے لگے میں کیوں نہ گھبراؤں۔ اگر بخش بھی دیا گیا تو اپنے کئے پر ندامت کا احساس کیا کم ہے۔

یہ بھی کوفہ میں احادیث کی تدریس میں مشغول رہے اور ۷۳ھ میں انتقال فرمایا۔

بصرہ (عراق)

(۱) ابو العالیہ، الریاحی

انہوں نے حضرت صدیقِ اکبرؓ کی زیارت کی اور حضرت ابیؓ سے قرآن سیکھا۔ حضرات عمرؓ و علیؓ، ام المومنین عائشہؓ، ابن مسعود وغیرہم رضی اللہ عنہم سے احادیث سنیں۔ مدینہ طیبہ میں علوم قرآن و سنّت حاصل کرنے کے بعد واپس بصرہ آگئے اور وہاں تدریسِ علم میں مشغول ہو گئے۔ صدہا اشخاص نے ان سے علمِ دین سیکھا۔ ان کے تلامذہ میں سے قتادہ، خالد الحذاء، داؤد بن ابی ہند اور ربیع بن انس بہت مشہور ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ انہیں اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے اور قریشی نیچے بیٹھے ہوئے ہوتے اور فرماتے:

هٰكذا العلم۔ يزيد الشريف شرفا۔

یعنی علم یوں شریفوں کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کرتا ہے۔

ابن ابی داؤد کہا کرتے تھے کہ صحابہ کے بعد ان سے زیادہ علوم قرآن کا کوئی ماہر نہیں۔

ان کے مندرجہ ذیل بیان سے ان کے شوقِ علم اور پابندیٔ شریعت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

جس وقت مجھے پتہ چلتا ہے کہ فلاں شخص کو حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی کسی حدیث کا علم ہے تو کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کے پاس پہنچتا ہوں۔ وہاں جا کر سب سے پہلے یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا پابندی سے نماز پڑھتا ہے اور نماز کے

ارکان کی ادائیگی کا کیا پورا پورا خیال رکھتا ہے۔ اگر اس کا تسلّی
بخش جواب پاتا ہوں تو اس کے ہاں قیام بھی کرتا ہوں اور اس
سے حدیث بھی سنتا ہوں لیکن اگر نماز کے بارے میں اس کی سہل
انگاری کا پتہ چلتا ہے تو واپس لوٹ آتا ہوں اور اس سے حدیث
نہیں سنتا اور کہتا ہوں

هو لغير الصلاة اضيع

یعنی جسے نماز کا پاس و اہتمام نہیں۔ وہ اگر کسی دوسری بات میں
غفلت کرے تو کیا بعید ہے۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۹۳ھ میں انتقال فرمایا۔

(۲) ابو عثمان النہدی البصریؒ

انہوں نے زمانۂ نبوت پایا لیکن زیارتِ نبوی سے مشرف نہیں ہوئے۔ حضرت
عمرؓ کے زمانہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے اور حضرت عمرو ابن مسعود و حذیفہ بن
الیمان اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم سے احادیث سنیں۔ پھر بصرہ لوٹ آئے
اور عمر بھر تدریسِ سنتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں مصروف رہے۔

حضرات قتادہ، خالد، حمید، داؤد، سلیمان التیمی وغیرہم نے ان سے علمِ حدیث
حاصل کیا۔ جنگِ یرموک میں مجاہدینِ اسلام کے ساتھ دادِ شجاعت دی۔ بہت بڑے
عالم، صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ نماز میں خضوع و خشوع کا یہ عالم تھا کہ
بسا اوقات بے ہوش ہو کر گر پڑتے ان کے ایک شاگرد سلیمان تیمی کہتے ہیں کہ میرا تو خیال
ہے کہ ان سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا۔ ان کی وفات سنہ ۱۰۰ھ میں ہوئی۔

(۳) ابو رجاء عمران بن ملحان العطاروی البصریؒ

فتح مکہ کے وقت ایمان لائے، لیکن زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ بعد میں مدینہ

طیبہ میں حاضر ہوئے اور حضرات عمر، علی، عمران بن حصین، ابی موسی الاشعری
رضی اللہ عنہم سے احادیث سنیں۔ ابو موسی الاشعریؓ سے ہی قرآن کریم پڑھا اور
حضرت ابن عباسؓ کو قرآن سُنایا۔

علم حاصل کرنے کے بعد بصرہ چلے گئے اور وہاں قرآن و سنت کی تدریس
میں آخر دم تک منہمک رہے۔ ایک کثیر تعداد نے آپ سے قرآنِ کریم پڑھا اور
ابو ایوب، ابن عون، حریر بن حازم، سعید بن ابی عروبہ اور مہدی بن ابی میمون نے
آپ سے احادیثِ نبوی روایت کیں۔

ابن اعرابی کہتے ہیں کہ یہ بہت بزرگ اور عبادت گزار تھے اور قرآن کی
تلاوت بہت کثرت سے کرتے تھے۔

سالِ وفات سنہ ۱۰۷ھ ہے۔

شام

(۱) عبد الرحمن بن غنم الاشعریؒ

انہوں نے حضرات عمرؓ، معاذ بن جبلؓ اور دیگر صحابہ کبار سے احادیث روایت
کیں۔ حضرت فاروقؓ نے انہیں شام کی طرف روانہ کیا تاکہ لوگوں کو وہاں علم دین
سکھلائیں۔ ان کی ولادت تو زمانۂ نبوت میں ہوئی لیکن زیارت نصیب نہیں
ہوئی، البتہ اُن کے والد غنم صحابی تھے۔

ابو مسہر غسانی انہیں رأس التابعین یعنی تابعین کا سردار کہا کرتے۔ ان
کی وفات سنہ ۷۸ھ میں ہوئی۔ ان کا لقب فقیہ الشام تھا۔

(۲) کثیر بن مرۃ الحمصیؒ

انہیں ستّر بدری صحابہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرات معاذ بن جبل،

ابی الدرداء، اور عبادہ بن الصامت سے احادیث نقل کی ہیں بہت بڑے
فاضل اور اپنے وقت کے امام تھے، ان کے بھی سینکڑوں شاگرد ہیں اور حمص
جو شام کا ایک مشہور شہر ہے، اس میں تدریسِ حدیث میں ساری عمر مشغول
رہے۔ وفات کا سال سنہ ۸۰ھ ہے۔

(۳) جبیر بن نفیرؒ

یہ بھی حمص کے رہنے والے تھے۔ ان کی ولادت زمانۂ نبوت میں ہوئی۔
انہوں نے حضرت ابی بکرؓ، عمرؓ، ابی ذرؓ، ابیؓ اور دیگر صحابہ سے احادیث روایت
کی ہیں اپنے وقت کے برگزیدہ علماء میں سے تھے یہ بھی ساری عمر حمص میں حدیث
شریف کی تعلیم دیتے رہے۔

(۴) عائذ اللہ بن عبد اللہ دمشقیؒ

انہوں نے حضرات معاذ بن جبل، ابی درداء، ابی ذر، حذیفہ، عبادہ بن
الصامت، عوف بن مالک اور ابی ہریرہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے احادیث
روایت کیں اور دمشق میں حلقۂ درس قائم کیا۔ اطراف واکناف سے طالبانِ
حدیث ان کے پاس آتے اور ان سے احادیث روایت کرتے۔ ان کے مشہور
تلامذہ میں سے چند کے نام یہ ہیں؛ امام زہریؒ، مکحولؒ، یحییٰ بن غسانیؒ، یونس بن
میسرہؒ۔ یہی دمشق کے قاضی بھی تھے، ان کے متعلق مشہور تھا کہ یہ وہ ہیں جنہوں
نے علم وعمل کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ امام زہریؒ نے انہیں فقہاءِ شام سے شمار کیا
ہے۔ سالِ وصال سنہ ۸۰ھ ہے۔

(۵) عبد اللہ بن محیریز بن جنادہؒ

یہ قریشی ہیں اور مکہ مکرمہ کے رہنے والے ہیں۔ بعد میں انہوں نے
بیت المقدس میں سکونت اختیار کی اور وہاں تدریسِ حدیث میں مشغول رہے

تو انہوں نے حضرات عبادہ بن صامت، ابی محذورہ، معاذ بن ابی سعید رضی
اللہ عنہم سے احادیث سنیں، مکحولؒ، امام زہریؒ، حسان بن عطیہؒ وغیرہ جلیل القدر
محدثین نے ان سے احادیث روایت کیں۔ صاحبِ فضل وکمال اور نہایت
سطوت وجلال کے مالک تھے اور عبادت گزار اس قدر تھے کہ تمام شہر کو ان
پر ناز تھا، رجاء بن حیوۃ کہا کرتے تھے کہ اہلِ مدینہ کو اپنے عابد ابن عمرؓ کی عبادت
پر ناز ہے تو ہمیں اپنے عابد محیریز پر فخر ہے۔ رجاء کا قول ہے کہ میں ان کے وجود
کو سارے عالم کی بقا کا ضامن سمجھتا ہوں۔

انہوں نے سنہ ۹۹ھ میں انتقال فرمایا۔

یہ چند نام بطورِ نمونہ ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ ہزارہا تابعین سلطنتِ
اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں ارشاداتِ نبوی کی تعلیم میں روز وشب منہمک رہے۔
بجز اس کے ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور مشغلہ ہی نہ تھا کہ لوگ ان کے پاس
آتے اور یہ انہیں کتاب وسنّت کی تعلیم دیتے۔ اسمائے رجال کی کتابیں ان کے
مبارک ناموں اور زریں کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ آپ اس مختصر سے خاکہ
سے زمرۂ محدثین کے علم وفضل، زہد وتقویٰ، طاعت وریاضت، بلندیٔ کردار اور
پاکیزگیٔ اخلاق کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایسے دل ودماغ اور فہم وذکاء کی مالک
ایک کثیر التعداد جماعت جب ایک چیز کی حفاظت واشاعت کو اپنی زندگی کا
محبوب نصب العین بنالے اور اس سے ان کے پیشِ نظر شہرت اور دنیاوی
جاہ وجلال کا حصول بھی نہ ہو۔ بلکہ اس ساری جگر کاوی کا معاوضہ وہ صرف
رضائے الٰہی کی صورت میں لینا چاہتے ہوں تو آپ انصاف فرمائیے کیا اس
چیز کے ضائع ہونے کا ذرا امکان تک بھی ہو سکتا ہے۔

فصل چہارم

آغازِ تدوین

پہلی صدی ہجری کا یہ وہ زمانہ ہے جب کہ احادیثِ نبوی باقاعدہ طور پر سلکِ تحریر میں پروئی نہیں گئی تھیں اور اس وقت تک صحابہ کرام کی مساعی اور تابعین کی کوششوں اور احتیاط کے باعث اس کی چنداں ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی لیکن جب سلطنتِ اسلامی کی حدود بہت وسیع ہوگئیں، مشرق میں ملتان، جنوب میں مصر اور شمالی افریقہ، مغرب میں اندلس اور شمال میں چینی ترکستان اور آرمینیا تک پرچم اسلام لہرانے لگا۔ جب متضاد تہذیب و تمدّن کی مالک مختلف زبان بولنے والی متعدد قومیں اور بے شمار ملک زیرِنگیں ہوئے اور علمائے تابعین کی تعداد میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی تو سب سے پہلے امام عادل خلیفہ برحق ثانی فاروق ؓ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تدوینِ حدیث کی ضرورت کا احساس کیا۔ آپ نے ۱۰۰ھ میں ابی بکر بن حزم والیٔ مدینہ طیبہ کو مندرجہ ذیل حکم بھیجا۔

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا تقبل الا الحدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یھلک حتی یکون سرا وکذلک کتب الی عمالہ فی امھات المدن الاسلامیة بجمع الحدیث۔

ترجمہ: حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کو نہایت احتیاط سے لکھ دو کیونکہ

مجھے اندیشہ ہے، کہیں علم کے آثار مٹ نہ جائیں اور علماء اس دارِ فانی سے رخصت نہ ہوجائیں اور رسولِ کریم ؐ کے فرمان کے بغیر کسی کا قول قبول نہ کر۔ چاہیئے کہ علماء علم کو پھیلائیں اور جو ناواقف ہیں ان کو سکھانے کے لئے بیٹھ جائیں، کیونکہ علم اگر راز ہوجائے (یعنی صرف چیدہ چیدہ لوگ اس سے واقف ہوں) تو اس کی فنا یقینی ہے۔ اسی طرح آپ نے مملکتِ اسلامیہ کے مشہور شہروں کے والیوں کی طرف بھی حدیث جمع کرنے کے احکام صادر فرمائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس حکم پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے امام محمد بن مسلم الزہری تھے۔

سب سے پہلے جامعینِ احادیث

اس کے بعد تدوینِ حدیث کا عام رواج ہوگیا۔ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے ابن جریج ؒ نے احادیث جمع کیں۔ مدینہ طیبہ میں یہ سعادت ابن اسحاق ؒ اور امام مالک ؒ کے حصہ میں آئی۔ کوفہ میں سبقت کا سہرا سفیان ثوری ؒ کے سر رہا۔ اس میں اختلاف ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے کس نے مجموعۂ حدیث مرتب کیا، مختلف اقوال میں ربیع بن صبیح ؒ، سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن مسلمہ ؒ کے نام مذکور ہیں۔ واسط میں ہشیم ؒ نے، یمن میں معمر ؒ نے، رے میں جریر بن عبدالحمید ؒ نے اور خراسان میں عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے احادیث کے مجموعے لکھے۔

اب مختصراً ان کے احوال قلم بند کئے جاتے ہیں تاکہ آپ پر واضح ہوجائے کہ سب سے پہلے جامعینِ حدیث کس پایہ کے بزرگ تھے، ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کا دھندلا سا نقشہ آپ کے سامنے ہوگا تو آپ آسانی سے

ان کی تصنیفات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

عمر بن عبدالعزیز

ان کی پیدائش مدینہ طیبہ کی سرزمین پاک میں اور تربیت مصر میں ہوئی جب کہ ان کے باپ عبدالعزیز مصر کے والی تھے۔ انہوں نے عبداللہ بن جعفر (صحابی) انس بن مالک (صحابی) ابی بکر بن عبدالرحمٰن، سعید بن مسیب اور عبیداللہ بن عبداللہ وغیرہم سے احادیث سنیں۔ ان کی جلالتِ علمی پر اس سے بڑھ کر اور کون شاہد ہو سکتا ہے کہ امام زہری، ایوب، ابوبکر بن حزم اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن جیسے ائمۂ احادیث نے ان سے احادیث روایت کیں۔ ان کے زہد و عدل کے باعث ان کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے۔ عدل و انصاف میں انہیں حضرت فاروقِ اعظمؓ زہد و تقویٰ میں حسن بصریؒ اور علم و فضل میں انہیں امام زہری سے تشبیہ دی جاتی ہے ان کے شجرِ علمی کا یہ حال تھا کہ قتادہ جو تفسیر کے مشہور امام ہیں، کہتے ہیں کہ ہم آتے ہیں عمر کو سکھانے کے لئے لیکن ہر بار ان کی استادی کا بارِ احسان لئے ہوئے ان کی مجلس سے اُٹھنا پڑتا ہے۔ میمونؒ کہتے ہیں کہ علماء حضرت عمر کے پاس ایسے ہیں جیسے اُستاد کے سامنے شاگرد۔

مالک بن دینارؒ کہا کرتے تم مجھے زاہد کہتے ہو، زاہد تو عمر بن عبدالعزیز تھے ان کے پاس دنیا آئی لیکن انہوں نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک از راہِ تعجب کہا کرتیں کیا کوئی صوم و صلوٰۃ میں عمر سے بھی سبقت لے جا سکتا ہے۔ میں نے عمر سے زیادہ جلالِ خداوندی سے ڈرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں ہی بیٹھے رہتے۔ ہاتھ اُٹھا کر روتے یہاں تک کہ اسی حالت میں آنکھ لگ جاتی۔ پھر بدک کر اُٹھتے اور دستِ طلب پھیلا کر مصروفِ گریہ و زاری ہو جاتے یہاں تک کہ پھر نیند کا غلبہ ہو جاتا۔

اسی طرح تمام رات بے کلی اور اضطراب کی نذر ہو جاتی۔

مکحول کہتے ہیں کہ اگر میں قسم کھا کر بھی کہوں کہ میں نے عمر سے زیادہ زاہد اور خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، تو میں اپنی قسم میں سچا ہوں گا۔

بنی امیہ نے سابقہ اموی خلفا کے عہد میں جن جاگیروں وغیرہ پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا تھا۔ آپ نے ان سے چھین کر مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ اس چیز نے بنی امیہ کو ان کا دشمن بنا دیا۔ انہوں نے سازش کر کے ایک غلام کے ذریعہ انہیں زہر دے دیا۔ آپ نے اس غلام کو بلا کر زہر دینے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس کے عوض مجھے ایک ہزار دینار دیا گیا ہے اور آزاد کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ آپ نے اس سے وہ ہزار دینار لے کر بیت المال میں داخل کر دیئے اور اسے حکم دیا کہ بھاگ جاؤ، پھر تمہیں کوئی دیکھنے نہ پائے۔

آپ کی سیرت کا ہر پہلو اس قابل ہے کہ اسے نہایت شرح و بسط سے منظرِ [illegible] پر لایا جائے تاکہ ہمارے اربابِ حکومت اس سے سبق سیکھیں لیکن یہ مختصر اس کی متحمل نہیں۔

یہاں تو صرف یہ دکھانا ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے تدوینِ حدیث کی طرف عملی قدم اٹھایا، وہ کس قسم کی شخصیت کا مالک تھا، کیا وہ اس طرح سے اپنے دنیاوی جاہ و جلال کا آرزومند تھا؟ وہ ہستی جسے تمام وسائلِ عیش میسّر تھے۔ جس کے پاس حکومت تھی، اقتدار تھا۔ اس کے باوجود جسے اپنے رب کا اس قدر خوف تھا کہ اپنے عہدِ خلافت میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور تین روپیہ (بارہ درہم) سے زائد کا لباس نہیں پہنا جس کے پاس اوڑھنے کے لئے صرف ایک چادر تھی۔ جس نے اپنے اڑھائی سالہ عہدِ خلافت میں ساری اسلامی دنیا کو عدل و انصاف سے معمور اور آباد کر دیا تھا کیا اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ اور اس

کے رسول کی رضامندی اور دینِ حنیف کی خدمت کے بغیر کوئی اور مقصد بھی تھا۔

ابو بکر محمد بن مسلم الزہریؒ

آپ کی ولادت مدینہ طیبہ میں ۵۰ھ میں ہوئی، آپ نے علمِ حدیث
حضرات ابن عمر، سہل بن سعد، انس بن مالک (صحابہ) محمود بن ربیع، سعید بن المسیب،
ابی امامہ اور دیگر صغار صحابہ اور کبار تابعین سے حاصل کیا اور ان کے تلامذہ میں
سے یونس، زبیدی، صالح بن کیسان، معمر، اوزاعی، امام مالک اور سفیان بن عیینہ
کا شمار ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔

زہری کہتے ہیں کہ آٹھ سال تک میرا زانو ابن مسیب کے زانو سے جدا نہیں
ہوا۔ یعنی میں نے آٹھ سال تک ان کی صحبت ترک نہیں کی۔

لیث (ان کے ایک شاگرد) سے ان کا یہ قول منقول ہے۔

ماصبر احد علی العلم صبری ولانشرہ احد نشری۔

یعنی طلبِ علم میں میری طرح کسی نے تکالیف اور مشقتوں پر صبر
نہیں کیا اور نہ ہی میری طرح کسی نے علم کی نشر واشاعت کی۔

یہی لیث کہتے ہیں کہ میں نے زہری سے بڑھ کر کسی کو جامع کمالات نہیں
پایا۔ وعظ کہنے کے لئے اٹھتے تو بس کہتا کہ وعظ ونصیحت کہنے میں اپنی نظیر نہیں
رکھتے۔ اگر ایام عرب اور انساب کا ذکر چھیڑتے تو یہ گمان ہوتا کہ اس میں لاجواب
ہیں اور قرآن وحدیث کے اسرار ومعارف بیان کرنے لگتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ
بحرِ بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

قدرت نے حافظہ اس بلا کا بخشا تھا کہ جو چیز ایک دفعہ نظر سے گزر جاتی، لوحِ
ذہن پر نقش فی الحجر کی طرح ثبت ہو جاتی۔ اسّی راتوں میں سارا قرآن مجید ازبر کیا۔
امام زہری خود کہا کرتے کہ مجھے اپنی یاد کردہ احادیث میں کبھی تردّد وشک نہیں ہوا۔

لیکن ایک دفعہ ایک حدیث میں کچھ اشتباہ سا ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا
تو وہ بعینہ ایسی تھی جیسے مجھے یاد تھی۔ فرماتے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنے دل
میں کوئی چیز بطورِ امانت رکھی ہو (یعنی یاد کی ہو) اور وہ مجھے بھول گئی ہو۔

قدرت سے حافظہ کا اتنا حظِ وافر ملنے کے باوجود کوشش کا یہ عالم تھا کہ
پینتالیس برس تک شام وحجاز میں مختلف علماء کے پاس حصولِ علم کے لئے حاضر
رہے اور اپنے اساتذہ کی خدمت اس تن دہی سے کیا کرتے کہ لوگ یہ سمجھنے لگتے
کہ یہ اُن کا شاگرد نہیں بلکہ زر خرید غلام ہے۔

اصولِ روایت کا اس قدر پاس تھا کہ کیا مجال کہ کوئی بغیر سند کے حدیث
روایت کرے ایک روز مدینہ طیبہ میں امام زہری اپنی علمی مجلس میں بیٹھے ہوئے
تھے، چاروں طرف شائقینِ علم حدیث کا ہجوم تھا۔ اتفاق سے اسحاق بن عبداللہ
نے کہا قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یعنی حدیث بیان کرنی شروع
کی، لیکن سند چھوڑ دی۔ امام زہریؒ غصہ سے بیتاب ہو کر بولے۔

مالك قاتلك الله یا ابن ابی فروۃ ما اجرأك علی الله اسند
حدیثك تحدثون باحادیث لیس لها خطم ولا ازمة۔

ترجمہ: خدا تمھیں ہلاک کرے، اے ابی فروہ (اسحاق کی کنیت) کس چیز نے تمھیں
اللہ تعالیٰ سے اس قدر بے باک کر دیا۔ اپنی حدیث کی سند بیان کر۔ تم ایسی
حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی نکیل ہے نہ لگام۔

قدرت نے مزاج بھی وہ شاہانہ بخشا تھا کہ زر وسیم کی پروا تک نہ تھی۔
عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے روپوں اور اشرفیوں کو جس قدر ذلیل امام زہریؒ کے
سامنے دیکھا اور کسی کے سامنے نہیں دیکھا۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے یہ اشرفیاں
نہیں مینگنیں ہیں۔

ان بے نظیر اوصاف و محاسن کے ساتھ مردِ مجاہد بھی تھے۔ میدانِ جنگ میں کفار سے جہاد کرنے میں ان کا قدم کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

ان گوناگوں خوبیوں کا مالک وہ شخص تھا جس نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے حدیث کا مجموعہ سنہ۱۰۱ھ میں باقاعدہ طور پر تحریر کیا۔ آپ کا وصال رمضان المبارک سنہ۱۲۴ھ میں ہوا۔ جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المؤمنین خیر الجزاء۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعۂ حدیث مرتب کرنے کے بعد بڑے بڑے ائمہ محدثین نے احادیث کی تدوین کا کام شروع کر دیا اور جس طرح پہلے عرض کیا گیا ہے سلطنتِ اسلامیہ کے علمی مرکزوں میں تدوینِ حدیث کا کام وہاں کے فضلاء نے اپنے ذمہ لیا۔

شیخ الاسلام الامام الاوزاعی

شام میں سب سے پہلے شیخ الاسلام امام اوزاعی نے حدیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ آپ کی ولادت سنہ۸۸ھ میں ہوئی۔ آپ نے علم حدیث عطا بن ابی رباح، ربیعہ بن یزید، امام زہری، یحییٰ ابن کثیر وغیرہم اکابر تابعین سے حاصل کیا۔ اور آپ کے شاگردوں میں شعبہ جنہیں علماء حدیث نے امیر المؤمنین فی الحدیث کا خطاب دیا، ابن مبارک، ولید بن مسلم، یحییٰ قطان، محمد بن یوسف الفریابی کے اسماء محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر فیض حاصل کرتے۔ آپ نے تبحرِ علمی کے باعث اپنے ہم عصر علماء سے بھی جو باہمی چشمک کی وجہ سے اعترافِ کمال میں بہت بخیل ہوتے ہیں، خراجِ تحسین وصول کیا۔

اسمٰعیل بن عباس سے مروی ہے کہ میں نے سنہ۱۴۰ھ میں علماء کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج امتِ مسلمہ کا عالم اوزاعی ہے۔ حزینی کہتے ہیں کہ کان الاوزاعی افضل

اہل زمانہ اپنے ہم عصروں میں اوزاعی سب سے افضل ہیں۔

حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والثناء کی سنت کا اتباع نہایت اہتمام سے کرتے اور دوسروں کو بھی اتباعِ سنت کی ترغیب دیتے۔ عامر بن یساف کہتے ہیں کہ میں نے امام اوزاعی کو یہ کہتے سنا کہ جب تمہیں رسول اللہ کا فرمان پہنچے تو اس سے سرِ مو انحراف نہ کرو۔ کیونکہ حضور ﷺ جو کچھ فرماتے حکمِ الٰہی ہوتا تھا۔

آپ فرماتے کہ صحابہ کرام اور تابعین ان پانچ چیزوں کی بہت سختی سے پابندی کرتے تھے (۱) لزومِ جماعت (۲) تلاوتِ قرآنِ کریم (۳) اتباعِ سنت (۴) مسجدوں کی آبادی اور رونق اور (۵) جہاد فی سبیل اللہ۔

امام اوزاعیؒ کے یہ ارشادات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں:۔

(۱) اصبر نفسك على السنة واسلك سبيل سلفك الصالح۔

اتباعِ سنتِ نبوی پر ثابت قدم رہو اور سلفِ صالحین کے راستہ پر گامزن رہو۔

(۲) لا يستقيم الايمان الا بالقول ولا يستقيم القول الا بالعمل ولا يستقيم الايمان والقول والعمل الا بالنية موافقةً للسنة۔

ایمان اقرارِ زبان کے بغیر درست نہیں اور اقرار عملِ صالح کے بغیر درست نہیں اور ایمان اقرار و عمل خلوصِ نیت کے بغیر درست نہیں کیونکہ حبیبِ کبریا علیہ الصلوٰۃ والثناء کا ارشاد ہے کہ انما الاعمال بالنیات۔

(۳) وكان من مضى من سلفنا لا يفرقون بين الايمان والعمل، العمل من الايمان والايمان من العمل ويصدق الايمان العمل فمن آمن بلسانه وعرف بقلبه وصدق ذلك بعمله فتلك العروة الوثقى التي لا انفصام لها۔ ومن قال بلسانه ولم يعرف بقلبه ولم

یصدقه بعمله لم یقبل منه وکان فی الآخرۃ من الخاسرین۔

ترجمہ:۔ ہمارے اسلاف ایمان اور عمل میں فرق نہیں کیا کرتے تھے۔ عمل جزوِ ایمان اور ایمان جزوِ عمل سمجھا جاتا تھا اور عمل ایمان کی تصدیق کرتا ہے، جس نے زبان سے ایمان کا اقرار کیا۔ دل سے اس کو تسلیم کیا اور عمل سے اس کی تصدیق کی۔ یہی ایسی مضبوط رسی ہے جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ اور جس نے صرف زبان سے تو اقرار کیا لیکن نہ اس کے دل نے اس کی حقانیت کو پہچانا اور نہ عمل نے اس کی تصدیق کی تو اس کا ایمان مردود ہوگا اور قیامت کے دن خاسرین کے گروہ میں سے ہوگا۔

حق گوئی میں لاجواب تھے۔ کسی ظالم کا ظلم یا کوئی طمع انہیں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ بارہا ابی جعفر منصور خلیفہ بغداد کو کھلے دربار میں نہایت بے باکی سے پند و موعظت فرماتے۔ ان کے ایک وعظ کے جو انہوں نے دربارِ منصوری میں فرمایا، آخری الفاظ یہ ہیں:۔

یا امیرالمؤمنین ان اشد الشدۃ القیام للہ بحقه و ان اکرم الکرم عند اللہ التقوی۔ انه من طلب العز بطاعة اللہ رفعه اللہ و من طلب بمعصیة اللہ اذله اللہ ووضعه هذه نصیحتی والسلام علیك۔

ترجمہ:۔ اے امیرالمؤمنین اللہ تعالیٰ کے حقوق کی صحیح ادائیگی سخت ترین کام ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی بزرگی تقویٰ ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے عزت کا متلاشی ہو اُسے وہ بلند کر دیتا ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کر کے عزت کا طالب ہو۔ اللہ تعالیٰ اُسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے یہ میری نصیحت ہے جو میں تمھیں کرنا چاہتا تھا تم پر اللہ تعالیٰ کا سلام ہو۔

سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز میں کچھ بلا کا اثر تھا۔ امام اوزاعیؒ تقریر کر رہے تھے، دربار میں سناٹا تھا اور منصور جیسا خلیفہ خوفِ الٰہی سے زار و قطار رو رہا تھا۔ جب امام تقریر کر کے رخصت ہونے لگے تو امیرالمؤمنین نے کچھ رقم بطور زادِ راہ پیش کی۔ آپ نے اسے رَد کرتے ہوئے فرمایا:۔

انا فی غنیً عنه وما کنت لابیع نصیحتی بعرض من الدنیا کلها۔

مجھے اس کی حاجت نہیں۔ میں اپنی اس نصیحت کو ساری دنیا کے سازوسامان کے عوض بیچنا بھی پسند نہیں کرتا۔

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا عبدالرحمٰن انت الذی تأمر بالمعروف وتنهی عن المنکر تو ہی وہ عبدالرحمٰن ہے جو نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ قلت بفضلك یا رب! میں نے عرض کی یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے اے میرے پروردگار۔ پھر میں نے عرض کی یارب امتنی علی الاسلام۔ الٰہی میرا خاتمہ اسلام پر کر۔ تو جواب ملا کہ دُعا کے ساتھ وعلی السنة کا بھی اضافہ کرو یعنی یہ دعا مانگو۔ یارب امتنی علی الاسلام وعلی السنة۔
اے میرے رب! میرا خاتمہ اسلام اور سنت خیرالانام علیه الصلوٰة والسلام پر ہو۔
اس شجرِ علمی کے ساتھ جہاد کا بہت شوق تھا۔ آخری عمر میں بیروت کی اسلامی سرحد پر جا کر مقیم ہوگئے اور اسلامی سرحدوں کو دشمن کی ہر غیر متوقع یلغار سے بچانے کے لئے ہر وقت کیل کانٹے سے لیس رہتے اور وہاں ہی ۱۵۷ھ میں جنت الفردوس کی راہ لی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنه۔

امام معمر بن راشدؒ

یمن میں سب سے پہلے انہوں نے احادیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ آپ نے علمِ حدیث امام زہری، قتادہ، عمرو بن دینار، یحیٰی بن کثیر وغیرہم فحول علماء سے حاصل کیا

اور یمن میں واپس آکر تدریسِ حدیث کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ ہزارہا عاشقانِ علمِ نبوت نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک و ہشام بن یوسف، عبدالرزاق وغیرہم ائمۂ حدیث بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے بے لاگ نقاد کی ان کے متعلق یہ رائے تھی:

لا تضم معمرا الی احد الا وجدته فوقه۔

یعنی جس سے بھی تو معمر کا موازنہ کرے معمر کو تو اس سے اعلیٰ پائے گا۔

ان کا ایک شاگرد عبدالرزاق کہتا ہے کہ میں نے معمر سے دس ہزار حدیثیں نقل کی ہیں۔ معمر کا اپنا قول ہے کہ جس وقت میں قتادہ سے پڑھا کرتا تھا، اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی، لیکن جو کچھ میں نے اس عمر میں سُنا آج بھی ایسے یاد ہے جیسے میری لوحِ صدر پر نقش ہو۔

آپ کا وصال رمضان المبارک ۱۵۳ھ میں ہوا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

سید الحفاظ شیخ الاسلام الامام سفیان بن سعید الثوریؒ

آپ نے سب سے پہلے کوفہ میں احادیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو سپردِ قلم کیا۔ آپ نے علمِ حدیث مشہور علماءِ عصر سے حاصل کیا۔ اور مدت العمر تدریسِ علم میں منہمک رہے۔ تدریسِ حدیث کا اس قدر شوق تھا کہ فرماتے کہ اگر مجھے پتہ چلے کہ فلاں شخص خدا اور رسول کی رضاجوئی کے لئے حدیث کا طالب ہے تو میں اسے یہاں آنے کی بھی تکلیف نہ دوں بلکہ اس کے گھر جاکر اسے احادیث کی تعلیم دوں۔ فرمایا کرتے لیس شیٔ انفع للناس من الحدیث کہ حدیث سے زیادہ لوگوں کے لئے اور کوئی چیز نفع بخش نہیں۔

آپ کے تلامذہ میں سے عبداللہ بن مبارک، یحییٰ قطان، ابن وہب، وکیع اور ابونعیم کا شمار ائمۂ حدیث میں ہوتا ہے۔

ان کے شاگرد عبداللہ بن مبارک کہا کرتے، میں نے گیارہ سو اساتذہ سے علمِ حدیث سیکھا، لیکن سفیان سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ یحییٰ قطان کہا کرتے کہ قوتِ حافظہ میں سفیان بے مثل تھے خود اپنے متعلق فرمایا کرتے ما استودعت قلبی شیئاً قط فخاننی میرے دل نے کبھی اس چیز میں خیانت نہیں کی جو میں نے اس میں امانت رکھی ہو یعنی جو کچھ میں نے یاد کیا مجھے بھولا نہیں۔

حصولِ حدیث کے شوق میں ملک ملک پھرے اور اساتذانِ احادیث کی خدمت میں چالیس سال تک حاضر رہے۔ تب جاکر تدریسِ حدیث کا کام شروع کیا۔ زید بن حباب کہتے ہیں کہ میں نے خود حضرت سفیان کو یہ کہتے سُنا کہ ایک بوڑھا میرے پاس آیا اور کوئی حدیث دریافت کی، میں نے جواب میں تامّل کیا تو وہ رو پڑا۔ میں اُٹھ کر اس کی طرف گیا اور تسلی دینے کے لئے اسے کہا کہ

یا ھٰذا تُرِیْدُ ما اخذتہٗ فی اربعین ان تاخذہ انت فی یوم واحد؟

میاں! جو علم میں نے چالیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد حاصل کیا، تو ایک ہی روز میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس کام میں عجلت نہیں کرنی چاہئے بلکہ صبر و استقامت سے کام لینا چاہئے۔

انہیں محدث کی نازک ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس تھا۔ مزاحم بن زفر نے ابوبکر بن عیاش کو آپ کا یہ مقولہ سنایا۔

انما ھو طلبۃ[1] ثم حفظہ[2] ثم العمل[3] بہ ثم نشرہ[4]

یعنی علمِ حدیث کے کئی مراتب ہیں۔ سب سے پیشتر طالب کو اس کے حصول کے لئے محنت کرنی ہوگی۔ پھر اسے یاد کرنا ہوگا اور پھر اسے عمل سے محکم کرنا ہوگا۔ جب یہ تین کٹھن مرحلے کوئی عالم طے کرلے، تب اسے یہ حق

پہنچتا ہے کہ مسندِ تدریس پر قدم رکھے۔

آپ فرماتے کہ متعلّم حدیث کو چاہئے کہ علمِ حدیث حاصل کرنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ ریاضت وعبادت سے صداقت، عدالت اور للّٰہیت کے اوصافِ جمیلہ کو نفس کی فطرتِ ثانیہ بنالے پھر اس علم شریف کی تحصیل کا قصد کرے۔

کان الرجل اذا اراد ان یکتب الحدیث تادب وتعبد قبل ذٰلک بعشرین سنة۔

ترجمہ:۔ جس وقت انسان حدیث کی کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ پہلے بیس سال تک مجاہدہ وعبادت سے نفس کی اصلاح کرے۔

تمام اقران وہمعصر فضلا ان کی شوکتِ علمی، پاکیزگیٔ اخلاق اور بالغ نظری کے معترف تھے۔ شعبہؒ جنہیں ایک دنیا امیر المؤمنین فی الحدیث کہتی ہے وہ حضرت سفیان کو اس اعزاز کا مستحق سمجھتے۔ سفیان ابن عیینہ (مشہور محدّث) کہتے کہ صحابہ کرام کے بعد تین شخص مسلمانوں کے امام گزرے ہیں۔ ابن عباسؓ اپنے زمانہ میں، شعبیؒ اپنے زمانہ میں اور سفیان ثوریؒ اپنے زمانہ میں۔ یہی ابن عیینہؒ کہا کرتے تھے کہ نہ میں نے سفیان ثوریؒ سے کوئی افضل دیکھا ہے اور نہ ہی سفیان ثوریؒ نے اپنا کوئی ہم پلّہ دیکھا۔

احمد بن یونس فرمایا کرتے کہ میں نے سفیان ثوریؒ سے بڑھ کر نہ کوئی عالم دیکھا ہے اور نہ محدّث، نہ فقیہ اور نہ زاہد۔

ان کے تبحرِ علمی کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ یحییٰ بن ایمان ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ میں نے ان سے بیس ہزار حدیثیں لکھیں اور ان کے ایک دوسرے شاگرد الشجعی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے تیس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔

لیکن باوجود اس عدیم النظیر تبحرِ علمی، زہد وتقویٰ کے عجز وانکسار طبیعت

میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ کبھی اپنے علم وفضل پر فخر نہیں کیا۔ ہمیشہ خشیتِ الٰہی سے آنکھیں ڈبڈبائی رہتیں اور چہرے پر حزن وملال کے آثار ہویدا رہتے۔ اکثر کہا کرتے لو لم اعلم لکان اقل حزنی اگر میں عالم نہ ہوتا تو میرے غم واندوہ کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔ دین کی اتنی عظیم الشان اور بے لوث خدمات انجام دینے کے بعد بھی اپنی کوتاہیوں کا احساس چین نہ لینے دیتا۔ فرمایا کرتے وددت ان انجو من ھٰذا الامر کفافاً لا علی ولا لی۔ یعنی میں اس خدمت گزاری پر کسی اجر کا امیدوار نہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ اس سے بلا مواخذہ رہائی ہو جائے۔

اس سے کوئی کج فہم یہ اندازہ نہ کرے کہ آپ نے نشر واشاعتِ حدیث میں کوئی کمی چھوڑی بلکہ یہ چیز تو اُن کے خوفِ الٰہی سے لبریز دل اور ادائے فرض کے تلخ احساس کی غمازی کرتی ہے۔

انہیں اپنی موہومہ لغزشوں کا اس قدر اندیشہ تھا کہ ان کے سامنے ان کی نظر میں ان کی یقینی نیکیاں بھی دھندلی پڑ جاتی تھیں۔ اس کی مثال ہمیں سیرتِ فاروقی میں بھی ملتی ہے۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جس بیدار مغزی، تندہی، دیانتداری اور بے نفسی سے دین وملّت کی خدمت کی۔ اس کے لئے وہ یقیناً بارگاہِ صمدیت سے بہتر سے بہتر انعام واکرام کے مستحق ہیں لیکن بایں ہمہ عجز وانکساری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا احساس دامن گیر رہتا اور اکثر اشکبار آنکھوں سے یہ کہتے ہوئے دستِ دُعا دراز کرتے کہ

یا رب لا لی ولا علیّ

ترجمہ:۔ الٰہی! میں ان خدمات کا معاوضہ کسی اجر کی صورت میں نہیں مانگتا۔ اس ذمّہ داری کی ادائیگی میں اگر کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو وہ معاف کردے

یہی میرے لئے سب سے بڑا معاوضہ ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے مستغنی دل عطا فرمایا تھا۔ دولت تو دولت رہی، اہلِ دولت کی بھی ذرا بھر دل میں وقعت نہیں تھی۔ ان کی محفل میں عزت واحترام کی نشستیں ہمیشہ فقراء و غرباء کے لئے وقف رہتیں اور اہل ثروت ع تیری محفل میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے — کہتے ہوئے جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔

یحییٰ بن یمان سے منقول ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا۔

العالم طبیب الدین والدرهم داء الدین فاذا جذب الطبیب الداء فمتی یداوی غیره۔

ترجمہ:- عالم دین کا طبیب ہے اور روپیہ دین کی بیماری ہے۔ اگر طبیب بیماری کو اپنی طرف کھینچنے لگے تو پھر وہ دوسروں کا کیا خاک علاج کرے گا۔

ان کا سنِ ولادت ۹۷ھ اور سنِ وفات ۱۶۱ھ ہے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

الامام الحافظ حماد بن سلمہ بن دینارؒ

یہ ان تین حضرات میں سے ہیں جنہوں نے بصرہ میں سب سے پہلے حدیث کی کتاب مرتب فرمائی۔ انہوں نے حدیث شریف اپنے ماموں حمید الطویل، ابن ابی ملیکہ اور انس بن سیرین وغیرہم علمائے حدیث سے پڑھی اور جم غفیر نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں عبداللہ بن مبارک، یحییٰ قطان، مہدی وغیرہم نے احادیث سنیں، ان کے ایک شاگرد عمرو بن عاصم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے تیرہ ہزار کے قریب حدیثیں لکھی ہیں۔ طلب حدیث کے لئے خلوص نیت کو بہت اہمیت دیا کرتے۔ فرماتے "رضاءِ الٰہی کے بغیر اگر کسی اور مقصد

کے لئے کوئی علم حدیث پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے فریب نفس میں گرفتار کر کے گمراہ کر دیتا ہے"۔ خود بھی تدریسِ حدیث سے بجز رضاء الٰہی کے کوئی چیز پیشِ نظر نہ تھی محمد بن حجاج سے مروی ہے کہ میرے ساتھ ایک شخص حمادؒ کی خدمت میں حدیث پڑھنے کے لئے حاضر ہوتا تھا۔ اسے کسی کام کے لئے چین جانا پڑا۔ جس وقت چین سے واپس لوٹا تو حضرت حماد کے لئے ایک تحفہ لیتا آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تحفہ قبول کرنے پر اصرار کرو تو میں تحفہ قبول کر لوں گا لیکن اس کے بعد تمھیں حدیث نہ سناؤں گا اور اگر حدیث سننے کے آرزومند ہو تو پھر تحفہ قبول نہیں کروں گا۔ اس نے عرض کی بے شک تحفہ رد کر دیجئے لیکن سماعِ حدیث سے محروم نہ کیجئے۔

علمی مشاغل کے باوجود اپنا فکر معاش خود کرتے۔ بازار میں ایک دکان لے رکھی تھی اور اوڑھنیاں بیچا کرتے جس وقت ایک دو اوڑھنیاں بک جاتیں اور اتنا نفع کما لیتے جس سے آٹھ پہر گزر سکیں تو دکان بند کر دیتے اور آ کر تدریسِ علم میں مشغول ہو جاتے۔

یادِ الٰہی میں اس قدر انہماک تھا کہ اگر ان سے کوئی یہ آ کر کہتا کہ کل تم نے مر جانا ہے تو وہ خوفِ موت سے بھی اپنی عبادت میں زیادتی نہ کر سکتے یعنی پہلے ہی اتنی عبادت کرتے تھے کہ اس میں زیادتی کی گنجائش تک نہ تھی۔ عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ بیشک میں نے ان سے زیادہ عبادت کرنے والے دیکھے ہیں لیکن نیکی، قرأت قرآن کریم اور اعمالِ حسنہ پر ان کی طرح پابند کوئی نہیں دیکھا۔

موسیٰ بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے انہیں کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تو میں صداقت پر ہوں گا کیونکہ وہ تعلیم حدیث، تلاوتِ قرآن، تسبیح و تہلیل اور اپنی نمازوں میں اس قدر مشغول رہتے کہ انہیں فرصت ہی نہ تھی۔

اسّی سال کی عمر میں ذوالحجہ ۱۶۷ھ میں نماز پڑھتے پڑھتے طائرِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے فردوسِ بریں کو سدھارا۔

ان کے وصال کے بعد ابان بن عبد الرحمٰن نے ان کے ہم نام حماد بن زید کو خواب میں دیکھا اور پوچھا، کیسے گزری؟ انہوں نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ پھر ابان نے ان سے حماد بن سلمہ (جن کا حال لکھا جا رہا ہے) کے متعلق دریافت کیا۔ قال هيهات ذالك في اعلى عليين کہنے لگے ان کے کیا کہنے۔ وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں۔

الامام الحافظ فقیہ الامۃ شیخ الاسلام مالک بن انس رضی اللہ عنہ

آپ نے امام زہریؒ کے بعد مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے احادیث نبوی کا مجموعہ مدون کیا جو مؤطا امام مالک کے نام سے چار دانگِ عالم میں غیر فانی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ آپ نے علمِ حدیث نافع، محمد بن منکدر، زہری اور دیگر تابعین اور تبع تابعین سے سیکھا۔ آپ کے فیض یافتگان کی تعداد کا شمار ناممکن ہے۔ تمام عالمِ اسلامی کے گوشہ گوشہ سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تشنگیٔ علم کا درماں کرتے۔

عبدالرزاق کہتے ہیں کہ حضور پر نور علیہ الصلوٰۃ والسلام الیٰ یوم النشور کی اس پیش گوئی کا مصداق ہم امام مالک کو ہی سمجھتے تھے۔ حضور کا ارشاد ہے:۔

یوشك الناس ان یضربوا اکباد الابل فی طلب العلم فلا یجدون عالما اعلم من عالم المدینۃ۔

ترجمہ:۔ عنقریب لوگ حصولِ علم کے لئے لمبے سفر کریں گے اور سفر کی مشقت کے باعث ان کی سواری کے اونٹوں کے جگر گھل جائیں گے لیکن انہیں مدینہ کے عالم سے زیادہ فاضل کوئی نہیں ملے گا۔

حجاز، شام، عراق، خراسان، مصر، شمالی افریقہ اور اندلس سے کھچ کھچ کر لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ابن جریج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی،

شعبہ، یحییٰ بن یحییٰ اندلسی، لیث بن سعید، عبداللہ بن مبارک، امام شافعی جو آسمانِ علم و فضل کے درخشندہ مہر و ماہ ہیں، ان سب کا آپ کے تلامذہ میں ہی شمار ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے۔ لولا مالك وابن عيينة لذهب علم الحجاز اگر مالک اور ابن عیینہ نہ ہوتے تو حجازیوں کا علم نیست و نابود ہو جاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا اس قدر احترام کرتے کہ دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ کا کام دیتا ہے۔ جب کوئی طالبِ علم دروازے پر دستک دیتا تو اپنی خادمہ کو بھیجتے کہ اس سے دریافت کرے کہ کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہے یا حدیث سننے کے لئے۔ اگر وہ کہتا کہ مجھے مسئلہ پوچھنا ہے تو اسی وقت دروازہ پر تشریف لاتے اور کھڑے کھڑے اسے جواب دے دیتے لیکن اگر وہ حدیث سننے کا خواہشمند ہوتا تو اُسے بیٹھنے کو کہتے، خود تازہ غسل کرتے، پاکیزہ لباس زیبِ تن فرماتے اور خوشبو لگاتے۔ پھر آپ کی نشست گاہ میں گاؤ تکیہ رکھا جاتا، آپ نہایت شان و شوکت سے وہاں رونق افروز ہوتے اس کے بعد اس طالب علم کو شرفِ باریابی بخشتے اور اسے حدیث سُناتے۔ آپ فرماتے تھے:۔

"احب ان اعظم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولا احدث بہ الا علی طھارۃ متمکنا وکان یکرہ ان یحدث فی الطریق وھو قائم او یستعجل۔

ترجمہ:۔ "میری دلی خواہش ہے کہ میں حضورؐ کے ارشادات کی ہر ممکن تعظیم و تکریم کروں اور باوضو پورے سکون و وقار کے ساتھ حدیث بیان کروں"۔ آپ راستہ میں کھڑے کھڑے یا جلدی میں حدیث بیان کرنے کو ناپسند فرمایا کرتے۔

ایک دفعہ ابن حازم درس دے رہے تھے۔ امام مالکؒ پاس سے گزر گئے۔ کسی نے پوچھا آپ کیوں درس میں شامل نہیں ہوئے۔ فرمایا وہاں بیٹھنے کو جگہ

نہ تھی اور میں نے مناسب نہ سمجھا کہ کھڑا ہو کر حدیث شریف سنوں۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ روئے زمین پر امام مالک سے زیادہ حضور کریمؐ کی احادیث پر کسی کو امین نہیں پایا۔ روایتِ حدیث میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ 'با' اور 'تا' کا فرق بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک مرتبہ امیر المؤمنین ہارون الرشید مدینہ پاک میں روضۂ انور کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ امام مالکؒ بھی ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ جب واپس آنے لگے تو خلیفہ نے مؤدبانہ التماس کیا کہ اگر آپ کرم فرمائیں اور ہر روز یہاں تشریف لا کر مامون و امین کو حدیث کی تعلیم دیں تو ازحد نوازش ہوگی۔ امام مالکؒ نے نہایت نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

مہ یا امیر المؤمنین لا تضع شیئاً رفعہ اللہ العلم یؤتی ولا یأتی۔

ترجمہ:۔ رہنے دو امیر المؤمنین! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی ہے تم کیوں اسے ذلیل کرنے کے درپے ہوتے ہو۔ لوگ علم کے پاس چل کر آتے ہیں یہ کسی کے پاس چل کر نہیں جاتا۔

ہارون الرشید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے معذرت خواہی کرتے ہوئے امام مالکؒ سے کہا: صدقت ایھا الشیخ کان ھٰذا ھفوۃ منی فاسترھا۔ اے شیخ! مجھ سے غلطی ہوئی معاف فرما دے۔

اس کے بعد شہزادے درِ دولت پر حاضر ہوتے لیکن جب وقت تک کوئی دوسرا طالب علم نہ آجاتا، امامؒ انہیں شرفِ باریابی نہ بخشتے۔ ہارون جس وقت مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے امام مالکؒ سے کہا، کاش آپ بغداد میں رونق افروز ہوں پھر دنیا دیکھے گی کہ میں آپ کی کس قدر عزت کرتا ہوں۔ لیکن آپ نے سرکارِ دوعالم کے درِ اقدس پر حاضری کو شاہی دربار میں عزت و اکرام کی سب سے اعلیٰ

کرسی پر ترجیح دی اور خلیفہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کو حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسرار و رموز میں اس طرح قلم بند کیا ہے۔

قائدِ اسلامیاں ہاروں رشید   آنکہ نغفور آبِ تیغِ او چشید
گفت مالک را کہ اے مولائے قوم   روشن از خاکِ درت سیمائے قوم
اے نوا پرداز گلزارِ حدیث   از تو خواہم درسِ اسرارِ حدیث
لعل تا کے پردہ بند اندر یمن   خیز و در دار الخلافت خیمہ زن
اے خوشا تابانیٔ روز عراق   اے خوشا حسنِ نظر سوز عراق
می چکد آبِ خضر از تاکِ او   مرہم زخم مسیحا خاکِ او
گفت مالک مصطفیٰ را چاکرم   نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم بستۂ فتراکِ او   برنخیزم از حریمِ پاکِ او
زندہ از تقبیلِ خاکِ یثربم   خوشتر از روزِ عراق آمد شبم
عشق می گوید کہ فرمانم پذیر   پادشاہاں را بخدمت ہم مگیر
تو ہمی خواہی مرا آقا شوی!   بندۂ آزاد را مولا شوی!
بہرِ تعلیمِ تو آیم بر درت   خادمِ ملت نہ گردد چاکرت
بہرہ خواہی اگر از علمِ دیں!   درمیاں حلقۂ درس نشیں

بے نیازی نازہا دارد بسے
ناز او اندازہا دارد بسے

محبوبِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو بے اندازہ عشق تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے اصطبل میں خراسان کے بہترین گھوڑے اور مصر کے بہترین خچر موجود تھے۔ میں نے ان سے بہتر گھوڑے اور خچر کہیں نہیں دیکھے۔ ایک روز میں نے از راہِ تعجب اُن سے کہا کہ یہ جانور کیا بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

فرمانے لگے اے شافعی! یہ سب میں تمہیں بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ انہیں قبول کرلو۔ میں نے عرض کی کہ کم ازکم ایک گھوڑا تو اپنی سواری کے لئے رکھ لیجئے۔ فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اس سرزمین پر گھوڑے کی سواری کروں جس میں خدا کا محبوب استراحت فرما ہے۔ مدینہ طیبہ سے والہانہ محبت تھی، ساری عمر میں صرف ایک دفعہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ گئے ورنہ ساری عمر میں اس اندیشہ سے کہ کہیں موت اس سرزمینِ پاک سے باہر نہ آجائے، مدینہ طیبہ سے غیر حاضر نہیں ہوئے ع

خوشترآں شہرے کہ دروے دلبراست

محبوبِ کریم کی بھی وہ نظرِ عنایت تھی کہ کبھی آپ نے مشاہدۂ جمالِ جہاں آرا سے انہیں محروم نہیں رکھا ابن سعید کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا کہ

مابت لیلۃ الارأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ:۔ کوئی رات ایسی نہیں گزری جب کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زیارت سے مشرف نہ کیا ہو۔

ابو عبداللہ ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں، انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں جلوہ افروز ہیں اور امام مالکؒ حضورؐ کے سامنے کھڑے ہیں اور لوگوں کا چاروں طرف ہجوم ہے حضور اکرمؐ کے پاس کستوری رکھی ہوئی ہے۔ حضورؐ مٹھی بھر کر امام مالکؒ کو دے رہے ہیں اور امامؒ اسے لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ فادلت ذٰلک العلم واتباع السنۃ میں نے اس خواب کی تعبیر علم اور اتباع سنت سے کی۔

امام شافعی ان کی کتاب مؤطا کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ماتحت ادیم السماء کتاب اصح من مؤطا مالک اس چرخِ نیلوفری کے نیچے مؤطا امامؒ سے

بڑھ کر اور صحیح کتاب نہیں۔

سنہ ۹۵ھ ولادت اور سنِ وفات سنہ ۱۷۹ھ ہے۔

الامام الحافظ شیخ الاسلام فخر المجاہدین عبداللہ بن مبارک

انہوں نے سب سے پہلے خراسان میں احادیثِ نبوی کو منضبط کیا۔ آپ کی ذات مجموعہ ہے۔ تمام اوصافِ جمیلہ کا اور ایک حسین مرقع ہے کمالاتِ جلیلہ کا۔ آپ کے گوناگوں فضائل سن کر انسان بے ساختہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت پر حیران ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

لیس علی اللہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

قدرتِ الٰہی سے کوئی بعید نہیں کہ ایک جرمِ صغیر میں تمام عالم کو سمو دے۔

آپ کے شاگردوں کی ایک جماعت کہیں اکٹھی ہوئی۔ کسی نے دریافت کیا کہ عبداللہ بن مبارک کے کمالات کا شمار کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ علم فقہ، ادب، نحو، لغت میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ زہد و شجاعت میں لاجواب تھے نغزگو شاعر اور ادیب تھے۔ شب بیداری، عبادت، حج، جہاد، شہسواری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ لایعنی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ نہایت منصف مزاج اور آشتی پسند تھے۔ سفیان ثوریؒ کہا کرتے:۔

لوجھدت جھدی ان اکون فی السنۃ ثلثۃ ایام علی ما علیہ ابن المبارک لم اقدر۔

ترجمہ:۔ میں کتنی ہی کوشش کروں کہ سال بھر میں تین روز بھی عبداللہ ابن مبارک کی طرح گزاروں تو نہیں گزار سکتا۔

شب و روز مطالعۂ حدیث میں گزار دیتے۔ شفیق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ

کسی نے ابن مبارک سے کہا کہ آپ نماز کے بعد ہمارے پاس کیوں نہیں بیٹھتے۔ آپ نے کہا کہ میں تم سے اُٹھ کر صحابہ وتابعین کے پاس چلا جاتا ہوں۔ ہم نے پوچھا کہ اب صحابہ وتابعین کہاں؟ فرمایا کہ اپنے علم کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتا ہوں، وہاں مجھے ان بزرگوں کے اقوال اور اعمال مل جاتے ہیں میں تمہارے پاس بیٹھ کر کیا کروں؟

انہوں نے اپنے مجموعۂ حدیث میں بیس ہزار احادیث جمع کی تھیں۔ ابواسامہ کہتے ہیں میں نے سارے عالم میں ابن مبارک سے بڑھ کر تحصیلِ علم کا شوق کسی میں نہیں دیکھا۔ خلوصِ نیت پر بہت زور دیتے تھے۔ فرمایا اگر ۲ دو شخص اکٹھے سفر پر روانہ ہوں، ان میں سے ایک شخص ۲ دو رکعتیں پڑھنے کا ارادہ کرے، لیکن اپنے رفیق کی رعایت کے باعث وہ ۲ دو رکعتیں چھوڑ دے تو وہ ریاکار ہوگا اور اگر اس کے دکھانے کے لئے ۲ دو رکعتیں پڑھے تو اس کا یہ فعل شرک ہوگا۔

آپ کے محامد و محاسن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

آپ کی ولادت سنہ ۱۱۸ھ میں ہوئی اور وصال سنہ ۱۸۱ھ میں ہوا۔

رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین

تدوین وترتیبِ احادیث کا یہ دور سنہ ۱۰۰ھ سے لے کر سنہ ۲۰۰ھ تک تقریباً جاری رہا ہے۔ اپنے اپنے مرکزوں میں محدثین احادیثِ نبوی کو منضبط کرتے رہے۔ لیکن اس دور میں مدونینِ احادیث ارشاداتِ نبوت کے ساتھ ساتھ اقوالِ صحابہ بھی تحریر کر دیا کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ارشاداتِ نبوت اور اقوالِ صحابہ کو بالکل خلط کر دیا جاتا تاکہ امتیاز ہی نہ ہو سکے۔ بلکہ یہ تصریح تو کر دیتے کہ یہ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فرمان ہے اور یہ دوسرا کسی صحابی کا قول ہے، لیکن یہ دونوں چیزیں ایک ہی جگہ مذکور ہوتیں۔

فصل چہارم

حصّہ دوم

تہذیب وتنقیح کا دور

اس کے بعد تہذیب وتنقیح کا دور شروع ہوا اور محدثین حضور انورؐ کے اقوال کو بالکل الگ مدون کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔ تاکہ خلط کا یہ معمولی سا اشتباہ بھی رفع ہو جائے اس لئے سنہ ۲۰۰ھ کے بعد مسانید کی ترتیب کا رواج ہو گیا۔

چنانچہ عبید اللہ بن موسیٰ کوفی متوفی سنہ ۲۱۳ھ، اسد بن موسیٰ متوفی سنہ ۲۱۲ھ، نعیم بن حماد مصری متوفی سنہ ۲۲۸ھ اور مسدد بصری سنہ ۲۲۸ھ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نے مسانید تصنیف فرمائیں۔ جن میں فقط وہ احادیث تھیں جن کا سلسلۂ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچتا۔

الامام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

یہ سلسلۂ تصنیف جاری رہا۔ یہاں تک کہ بطلِ جلیل استاذ المحدثین حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا عہدِ ہمایوں آیا۔ آپ علم حدیث وفقہ، زہد واتقا، فہم وذکاء اور قوتِ حافظہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آپ نے بغداد میں نشوونما پائی اور ابتدائی علوم اور علمِ حدیث بغداد اور اس کے قرب وجوار کے علماء سے حاصل کئے بعد ازاں طلبِ کمال کے لئے سفر اختیار کیا کوفہ، بصرہ، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، یمن، شام، تبریز کے علاوہ متعدد ممالک میں علماء عصر کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ احادیث میں یزید بن ہارون یحییٰ بن سعید، سفیان بن عیینہ اور امام شافعی کے نام مشہور ہیں۔ آپ کے تلامذہ

حدِ شمار سے باہر ہیں۔ امام بخاری، امام مسلم، ابوزرعہ اور ابوداؤد سجستانی بھی آپ کے خوشہ چینوں میں سے ہیں۔

دارمی کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے امام احمدؒ سے بڑھ کر حافظِ حدیث اور کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کو ساڑھے سات لاکھ احادیث ازبر تھیں اور آپ نے اپنی تیس ہزار حدیثیں جمع کیں۔ اس زمانہ میں بھی آپ کی مسند تمام دیگر مسانید سے اعلیٰ وارفع اور جامع شمار کی جاتی تھی۔

یہ سنتِ الٰہی ہے کہ مقربانِ بارگاہِ صمدیت اور رسیدگانِ حریمِ احدیت کو ابتلا و آزمائش کے جاں گسل اور جگر سوز مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاید اس لئے کہ دنیا کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ انہیں یہ تاجِ کرامت بلا استحقاق نہیں بخشا گیا بلکہ یہ اس کے ہر طرح سے اہل تھے اور یا اس لئے کہ بندگانِ ہوا و ہوس اس ہجوم بلا سے خوف زدہ ہو کر ادھر کا رُخ نہ کریں۔ وجہ کچھ بھی ہو ازل سے سنتِ الٰہی یہی ہے اور ابد تک یونہی ہوتا رہے گا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

بشر مریسی اور قاضی ابوداؤد معتزلیوں نے جب خلقِ قرآن کا ایک نیا فتنہ کھڑا کیا اور مامون اور معتصم نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں اس کی حمایت و اشاعت کے لئے اپنی خون آشام تلواریں بے نیام کر لیں تو علماءِ امت پر طوفانِ بلا اُمڈ آیا۔ آج کل کے علمبردارانِ تجدد کی طرح وہ بھی علماءِ حق پر رجعت پسندی، کورانہ تقلید اور ترکِ قرآن کے الزام تراشتے، بلکہ ان کے احوال پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نئے شاگردوں کو ابھی اپنے ان کہنہ مشق اساتذہ سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے لیکن علماءِ اسلام نے دینِ برحق کی نگہبانی کرتے ہوئے ہر جور و ستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، لیکن جس پامردی اور حوصلہ سے حضرت امام احمد نے ان تکالیف کا مقابلہ کیا وہ زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی کو سُود و زیاں اور مسرت و غم کے مقیاس

سے اندازہ کرنے والوں کے لئے ہمیشہ سے ایک معمہ ہے۔ اس جرم میں کہ وہ کلامِ الٰہی کو اس کے موصوف کی طرح ازلی اور قدیم کیوں مانتے ہیں۔ ان کو قید کیا گیا اور چار چار بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں۔ اسی حالت میں انہیں بغداد سے طرطوس لے گئے اور حکم تھا کہ کسی کی امداد کے بغیر اونٹ پر سوار ہوں اور اُتریں عین رمضان کے آخری عشرہ میں کوڑوں کی سزا دی گئی ؎

دزدی نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

ہر جلاد اپنی پوری قوت سے دو کوڑے لگاتا اور ہٹ جاتا اور دوسرے دو کوڑے لگانے کے لئے تازہ دم جلاد طلب کیا جاتا لیکن اس عزم و ثبات کے پہاڑ کو جنبش تک نہ ہوئی۔ نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر شکوہ اور نہ دل میں ملال۔ ہر بار اعترافِ جرم کا نیا سودا۔ وقفہ ملنے پر پوری جرأت سے اعلان فرماتے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق قرآن کلام الٰہی ہے اور قدیم ہے حادث نہیں۔

خود معتصم باللہ جس کی ہیبت سے قیصرِ روم لرزہ بر اندام۔ بار بار کہتا۔

یا احمد واللہ انی علیک شفیق وانی لاشفق علیک کشفقتی علیٰ ھارون ابنی واللہ لئن اجبتنی لاطلقن عنک بیدی ما تقول۔

ترجمہ:۔ اے احمد! بخدا مجھے تو اپنے بچے ہارون سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ خدا کی قسم، اگر تو میری بات مان لے (کہ قرآن مخلوق ہے اور حادث) تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں گا۔ کہو، کیا خیال ہے؟

آپ جواب میں صرف یہ فرماتے:۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ و سنۃ رسولہ حتی اقول بہ

ترجمہ:۔ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لئے مجھے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل سناؤ،

تاکہ میں اس کا قول کروں۔

معتصم باللہ عاجز آ کر قاضی ابی داؤد وغیرہ کو کہتا ناظروہ وکلموہ تم ان سے مناظرہ کرو اور ان سے گفتگو کرو۔ اور وہ کتاب وسنت کے میدان میں عاجز آ کر اپنے اوہام وظنونِ باطلہ کو عقل ورائے کے نام سے پیش کرتے جو سرتا سر یونانیت سے ماخوذ ہوتے تو امام احمد اس کے جواب میں بے ساختہ بول اُٹھے۔

ما ادری ماھٰذا اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او من سنة رسوله حتی اقول به۔

ترجمہ: میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا استدلال ہے۔ میرے سامنے تو قرآن کی کوئی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث پیش کرو تاکہ میں تمہارا ہمنوا بنوں۔

امام موصوف کے ان خط کشیدہ الفاظ پر مزید غور فرمایئے۔ انہوں نے کس صراحت سے ارشادِ نبوی ﷺ کو حجت تسلیم کیا ہے اور اس شبہ کی کس جرأت سے نفی کی ہے کہ احادیث فقط تاریخی حیثیت سے قابلِ التفات ہیں۔ انہیں بطور دلیل وحجت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے آج کل چند لوگوں کا خیال ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان لوگوں کے قول پر جن کی سیرت وکردار آپ کے پیشِ نظر ہے۔ حضرت امام احمدؒ کے قول کو ترجیح نہ دیں۔

امام موصوف کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ فرمایا کرتے رحم اللہ ابا الهیثم غفر اللہ لابی الهیثم۔ اللہ تعالیٰ ابی الہیثم پر رحم فرمائے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشے۔ میں نے دریافت کیا کہ قبلہ! یہ ابی الہیثم کون شخص ہے جس کے لئے آپ ہر وقت دُعا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بغداد کا لوہار تھا اور چوری کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب مجھے خلقِ قرآن کا اقرار نہ کرنے کے جرم میں سپاہی کوڑے لگانے کے لئے لے جارہے تھے وہ میرے پاس آیا اور مجھے اپنی پیٹھ

دکھا کر کہنے لگا کہ مجھے چوری کی عادت ہے اور اس جرم میں میری پیٹھ پر اٹھارہ ہزار کوڑے لگ چکے ہیں لیکن اتنی سزا کے باوجود چوری ترک نہیں کی۔ تم چند کوڑوں کے خوف سے کہیں حق کو نہ چھوڑ دینا۔ مجھے اس کی نصیحت سے بہت استقامت حاصل ہوئی اس لئے میں اس کے لئے دُعائے مغفرت کرتا ہوں۔

حافظ ابن جوزی نے محمد بن اسمٰعیل بخاری کا قول نقل کیا ہے کہ امام احمدؒ کو اسّی کوڑے مارے گئے کہ اگر ہاتھی کو بھی مارے جاتے تو چیخ اٹھتا لیکن آپ ہر کوڑے پر وہی نعرہ لگاتے:

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور یا طمانیتِ خاطر کے لئے یہ آیت تلاوت کرتے لَن یُّصِیبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر جو ہماری قسمت میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (اس لئے جزع وفزع لاحاصل ہے)۔

مامون ومعتصم اور واثق کے زمانۂ حکومت میں تو یہی حال رہا۔ جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے پچھلے مظالم کی تلافی کے لئے لطف واکرام کا دروازہ کھول دیا۔

ایک بار ایک لاکھ درہم بھیجا اور اس کے قبول کرنے پر اصرار کیا تو آپ نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کھیتی باڑی کر لیا کرتا ہوں جو مجھے کافی ہو جاتی ہے اس بوجھ کو اٹھا کر کیا کروں گا۔ لانے والوں نے کہا کہ امیر المؤمنین کا کہنا ہے کہ قبول کر لیجئے اور پھر فقراء ومساکین میں بانٹ دیجئے۔ فرمایا میرے دروازے سے زیادہ امیر المؤمنین کے محل کے نیچے فقیروں کا جھرمٹ رہتا ہے انہیں دیجئے۔ یہاں اس ہنگامہ کی ضرورت نہیں۔

متوکل کی تعظیم وتکریم کو دیکھ کر فرمایا کرتے:-

هذا امر اشد علیّ من ذالک ۔ ذاک فتنۃ الدین وھذا
فتنۃ الدنیا۔

یہ آزمائش اُس سے بھی سخت تر ہے وہ دین کی آزمائش تھی اور یہ دنیا کی۔

اپنے احباب کے تحائف قبول کرنے سے بھی گریز کیا کرتے حسن بن عبدالعزیز
نامی ایک شخص کو اپنے باپ کی وراثت سے ایک لاکھ اشرفی حصہ میں آئی ۔ اس
نے ہزار ہزار کی تھیلیاں آپ کی خدمت میں بھیجیں اور ساتھ ہی یہ عرض کر بھیجی کہ
یہ صدقہ وزکوٰۃ نہیں بلکہ میراث کے حلال مال سے ہے اور اس ہدیہ کو قبول فرمائیے اور
اسے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیجئے ۔ لیکن اقلیم استغناء سیر چشمی کے اس بادشاہ نے
لاحاجۃ لی فیھا (مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں) کہہ کر واپس کر دیا۔

گرچہ آلودہ زفقرم شرم باد از ہمتم
گر بآبِ چشمۂ خورشید دامن تر کنم

ساری عمر فقر وفاقہ میں گزار دی اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
ارشادات واقوال کی حفاظت میں ذرا سا تساہل نہ کیا۔

وہ حضرات جو اپنے آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے نہایت بے باکی اور
جرأت سے فرما دیا کرتے ہیں کہ ان محدثین اور حکومتِ وقت میں ملی بھگت
تھی، بادشاہ ان علماء اور محدثین کی پرورش کرتے تھے اور یہ ان کے تخت
وتاج کی حفاظت کیا کرتے اور انہیں علماء کی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں
نے اسلام میں برہمنیت کے فاسد نظام کو رائج کیا۔

اب ان حضرات گرامی قدر سے کوئی دریافت کرے کہ کیا ان کے یہ بہتان
اور تہمتیں ان نفوسِ قدسیہ اور ان ارواحِ طیبہ پر ہیں جن کے استغناء، حریت
ضمیر، حبِ خداوندی اور عشقِ مصطفوی کا ہم نے مختصر سا تذکرہ کیا۔ جن کی

شجاعت کا یہ عالم تھا کہ وہ حق کی پاسبانی کے لئے باطل کی تمام قہرمانیوں کے
سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے تھے ۔ جن کے صبر وثبات کی یہ کیفیت تھی کہ
ابتلاء وآزمائش کی انتہائی المناک گھڑیوں میں بھی ان کی زبان شکوہ سنج نہ ہوئی۔
اور ان کے لبوں پر آہ تک نہ آئی۔

ان پیکرانِ صدق وصفا پر اعتراض کرنے کی ان لوگوں کو تو جرأت نہ ہونی چاہئیے
جو خود حکومتوں کے پروردہ ہیں اور جن کی رگِ جاں پنجۂ حکام میں ہے۔
مسلمان تو آج بھی نہایت بے دھڑک ہو کر ساری دنیا کو چیلنج دے سکتا ہے کہ

اولٰئِکَ اٰبائی فجئنی بمثلھم — اذا جمعتنا یا جریر المجامع

(یعنی) یہ ہیں میرے اسلاف جن کے کارناموں پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں
اگر تم میں بھی ان کا کوئی ہم پلہ ہو تو مجمع عام میں اسے پیش کرنے کی جرأت کرو۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (بجاہہ علینا) کے تبحرِ علمی اور جلالتِ شان
کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شیخ الشیوخ قدوۃ الاولیا قطب الاقطاب غوث الاعظم
سیدنا محی الدین ابی محمد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا باوجود مجتہد
ہونے کے آپ کے فقہی مسلک پر عامل رہے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۶۴ھ اوائل ربیع الاول میں ہوئی اور سفر آخرت
۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ بروز جمعہ اختیار فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

آپ کے معاصرین میں سے اسحٰق بن راہویہ اور عثمان بن شیبہ وغیرہم نے
بھی مسانید تصنیف کیں۔

امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ

تصنیف وتالیف کا یہ تسلسل ہر زمانہ میں قائم رہا۔
یہاں تک کہ امام البخاریؒ پیدا ہوئے اور انہوں نے فنِ تدوین حدیث کو

معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور احادیث کی تنقیح و تہذیب کے لئے ایسے اصول مرتب کئے جس کے بعد کسی کو شک وشبہ کی گنجائش تک باقی نہ رہی اور یہ امام بخاریؒ کا وہ احسانِ عظیم ہے جس کے لئے ساری اُمت ان کی ممنون ہے۔ ان کے احوال بھی مختصراً پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کی کنیت ابوعبداللہ، نام نامی محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم ہے۔ بخارا میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت شوال ۱۹۴ھ ہے۔ بچپن میں ہی عبداللہ بن مبارک کی حدیث کی تصنیفات ازبر کرلیں۔ پہلے اپنے شہر بخارا کے فضلا محمد بن سلام المسندیؒ محمد بن یوسف بیکندی سے ان کی مرویات سنیں۔ اس کے بعد اپنی ماں اور ہمشیرہ کی معیت میں طلبِ علم کے لئے اپنے وطنِ عزیز سے رحلت کی اور مختلف ممالک میں پھر کر ائمۂ کبار سے علم حاصل کیا۔ بلخ میں مکی بن ابراہیم سے، بغداد میں عفان سے، مکہ مکرمہ میں المقری سے، بصرہ میں ابی عاصم اور انصاری سے، کوفہ میں عبیداللہ بن موسیٰ سے، شام میں ابی المغیرہ اور فریابی سے، عسقلان میں آدم سے، حمص میں ابی الیمان سے، دمشق میں ابی مسہر سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ کے اساتذۂ حدیث کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے[1]۔

فہم وذکاء میں بےنظیر تھے۔ ڈاڑھی کے بال اُگنے سے پہلے کتابیں تصنیف کرنے لگے تھے اور حدیث کی روایت کرتے تھے۔ خود کہتے تھے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں مدینۃ العلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے جوار میں بیٹھ کر چاند کی چاندنی میں 'تاریخ' تصنیف کی۔

قوتِ حافظہ بلا کی ارزانی ہوئی تھی۔ ان کے ایک ہم سبق حاشد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ بچپنے میں ہمارے ساتھ علماء کے پاس حدیث پڑھنے کے لئے جایا

[1] تہذیب الاسماء للنووی بالاختصار، ج ۱ ص ۷۔

کرتے۔ ہم جو کچھ اُستاد سے سُنتے اسے سپردِ قلم کرلیتے لیکن آپ ایسا نہ کرتے۔ جب کافی روز گزر گئے تو ہم نے ازراہِ بہی خواہی انہیں تنبیہ کرنی شروع کی کہ تم کیوں عمر ضائع کر رہے ہو۔ آخر تمہیں اپنے قیمتی وقت کی قدر کرنی چاہئے، اگر تم احادیث لکھو گے نہیں تو سب فراموش ہو جائیں گی۔ کچھ روز تو چپکے سے ہماری باتوں کو سن کر ٹالتے رہے۔ آخر ایک روز تنگ آکر کہنے لگے کہ جو کچھ تم نے آج تک لکھا ہے وہ لے آؤ۔ جب ہم لے آئے تو کہا کہ تم انہیں دیکھتے جاؤ اور میں یاد سناتا جاتا ہوں۔ حاشد کا بیان ہے کہ ہم نے پندرہ ہزار سے زائد احادیث لکھی ہوئی تھیں وہ سب آپ نے یاد سنا دیں اور ہم تصویرِ حیرت بنے سنتے رہے۔

تکمیلِ علم کے بعد آپ کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ عروس البلاد ان دنوں علماء وفضلا کا مرکز تھا، جب انہوں نے ایک بخاری نوجوان کے تبحرِ علمی کی شہرت سُنی تو ان کا امتحان لینے کے لئے ایک علمی مجلس منعقد کی۔ امام بخاریؒ جن کی عمر اس وقت بیس سال سے متجاوز نہ تھی، مجلس کے وسط میں بٹھائے گئے اور دوسرے فضلاء حلقہ باندھ کر ان کے اردگرد بیٹھ گئے۔ طریقۂ امتحان یہ تجویز ہوا کہ علماء متعدد حدیثیں امام بخاریؒ کو سنائیں گے اگر ان کی سند میں یا متن میں غلطی ہو تو بخاریؒ اس کی تصحیح کردیں۔

ایک عالم نے دس حدیثیں اس طرح پڑھیں کہ ایک حدیث کی سند پڑھی اور اس کے ساتھ دوسری حدیث کا متن لگا دیا۔ سند میں استاد کی جگہ شاگرد اور شاگرد کی جگہ استاد کا نام لے دیا۔ راویوں کے ناموں میں تغیر کردیا۔ غرض کہ جو مشکل وہ روایتِ حدیث میں پیدا کرسکتے تھے پیدا کی اور امام بخاریؒ خاموشی سے سنتے رہے اسی طرح دوسرے تیسرے عالم نے کیا۔ یہاں تک کہ دس علماء نے دس دس احادیث اس طریقہ پر انہیں سنائیں۔ جب ایک سو حدیثیں پڑھی جا چکیں تو اب امام بخاریؒ

نے سر اٹھایا اور پہلے عالم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ آپ نے جو پہلی حدیث پڑھی ہے اس کی سند میں آپ نے تقدیم و تاخیر کر دی۔ اصل سند اس طرح ہے۔ غرض کہ باری باری تمام علماء کی بیان کردہ سو احادیث میں جتنی مشکلیں پیدا کی گئی تھیں انہیں حل کر دیا۔ دنیا آپ کی حیرت انگیز قوتِ یادداشت اور تیزیٔ فہم پر حیران رہ گئی اور بغداد کے فضلاء نے آپ کی جلالتِ علمی اور بے نظیر قابلیت کا اعتراف کیا۔

امام بخاریؒ کا اپنا قول ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں[1]۔ غیر صحیح کے یاد کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کیونکہ اس کے بغیر صحیح و غیر صحیح میں امتیاز مشکل تھا۔

ان کے ہمعصر ائمۂ حدیث آپ کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ ایک دفعہ امام مسلمؒ ان کے پاس آئے اور فرطِ عقیدت سے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا دعنی اقبل رجلیك یا طبیب الحدیث یا استاذ الاساتذة یا سید المحدثین[2] اے پاکیزہ حدیث والے استاذوں کے استاذ اور اے محدثین کے سردار! مجھے اجازت دو تاکہ میں تیرے دونوں پاؤں کو بوسہ دوں۔

امام ترمذیؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے ان کا نظیر کوئی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو امت مصطفوی کی زینت بنایا ہے۔ ابن خزیمہ فرماتے کہ اس سپہر نیلگوں کے نیچے آپ سے زیادہ اسرار حدیث سے آگاہ اور احادیث کا حافظ کوئی نہیں۔ بعض علماء کہا کرتے کہ آپ آیاتِ خداوندی سے ایک ہیں۔

آپ بہت خوشحال اور متمول تھے۔ اس کے ساتھ دل بہت سخی اور مزاج بہت کریم پایا تھا۔ اپنے مال کا اکثر حصہ طلباء پر خرچ کرتے اور غرباء و مساکین کی ضروریات کا ہر وقت خیال رکھتے۔ زہد و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ چالیس سال

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۶۸۔ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۶۷۔

تک سوکھی روٹی کھائی اور سالن تک استعمال نہ کیا۔

اتنے فضل و کمال کے مالک نے صحیح بخاری مرتب فرمائی۔ کس حزم و احتیاط اور کتنی عرق ریزی و جگر کاوی اور کس اخلاص نیت سے؟ یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں۔

امام بخاریؒ خود بیان کرتے ہیں کہ صحیح بخاری کی تدوین کا محرک ایک خواب ہوا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ سرکارِ دوعالم تشریف فرما ہیں اور میں پنکھا سے ہوا بھی کر رہا ہوں اور حضورؐ کے رُخِ انور کے قریب جانے والی مکھیاں بھی اڑا رہا ہوں۔ صبح میں نے ایک معبّر سے خواب کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ تجھے خدا توفیق دے گا اور تو کذب و افترا کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دور کرے گا۔ اس کے بعد میرے دل میں حدیثِ صحیح کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور سولہ سال کے عرصۂ دراز میں اس کی تکمیل ہوئی۔

سب سے پہلے اس کا مسودہ مسجد حرام میں بیٹھ کر لکھا اور لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے آپ زمزم سے غسل فرماتے اور مقام ابراہیم میں دو رکعت نفل نیتِ استخارہ پڑھتے اور اس کے بعد وہ حدیث قلم بند کرتے جس کی صحت کے متعلق انہیں یقین ہو جاتا۔ مسودہ مکمل کرنے کے بعد مدینہ طیبہ میں حبیب کبریا علیہ افضل التحیۃ والثناء کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے اور روضۂ اطہر اور منبر نبوی کے درمیان بیٹھ کر اس مسودہ کو دوبارہ لکھا۔ اب کے بھی لکھنے کا وہی دستور تھا کہ ہر حدیث لکھنے سے پہلے دو رکعت نفل استخارہ پڑھتے اور کچھ دیر مراقبہ کرتے اور پھر حدیث تحریر کرتے۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کر کے سولہ سال کی طویل مدت میں اس صحیح کی تکمیل کی وجعلتہ حجۃ بینی و بین اللہ۔ اور میں نے اسے اپنے اور اپنے رب کے درمیان حجت بنایا ہے۔

امام ابن حجر شارح بخاری لکھتے ہیں کہ احادیث بخاریؒ کی تعداد مع تعلیقات شواہد اور مکررات نو ہزار چھ سو بیاسی (۹۶۸۲) ہے اور اگر مکرّرات کو حذف کر دیا جائے اور تعلیقات و شواہد کو شمار نہ کیا جائے تو احادیثِ مرفوعہ کی کل تعداد دو ہزار چھ سو تیئیس (۲۶۲۳) ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ التزام کیا ہے کہ اس کتاب میں جو احادیث ہوں صحیح ہوں، لیکن اس کا التزام میرے پیشِ نظر نہ تھا کہ ہر صحیح حدیث اس کتاب میں درج ہو جائے (کیونکہ تمام احادیثِ صحیحہ کا احاطہ اس میں ممکن نہ تھا)۔

اس لئے یہ خیال کر لینا کہ جو احادیث امام بخاریؒ نے جامع صحیح میں درج نہیں کیں وہ اُن کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط تھیں اور ان کے نزدیک چھ لاکھ احادیث میں سے فقط اتنی تعداد ہی احادیث صحیحہ کی تھی اور باقی اتنی کثیر تعداد موضوع احادیث کی تھی یہ بالکل غلط اور خلافِ حقیقت ہے۔

محنت، مشقت، اخلاص، دیانت اور احتیاط و احساس ذمہ داری سے لکھے ہوئے اس شاہکار کو بارگاہِ الٰہی اور دربارِ رسالت پناہی میں وہ قبولیت نصیب ہوئی کہ سبحان اللہ۔ ابو زید مروزی (محدث) ذکر کرتے ہیں کہ میں مسجد حرام میں گیا اور مقام ابراہیمؑ کے درمیان محو خواب تھا کہ فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

اے ابو زید! چرا کتاب مرا درس نمی گوئی؟ گفتم یا رسول اللہؐ کتاب تو کدام است؟ گفت کتاب محمد بن اسمٰعیل بخاری۔

یعنی اے ابو زید! تم میری کتاب کیوں نہیں پڑھاتے؟ میں نے عرض کی، اے جانِ عالم! حضورؐ کی کون سی کتاب ہے۔ ارشاد ہوا، محمد بن اسمٰعیل بخاری کی تصنیف کردہ کتاب۔

بخاریؒ اپنے بختِ فرخندہ پر جتنا فخر کریں اتنا کم اور امت مصطفوی اس نعمتِ عظمیٰ پر جتنا شکر ایزدی بجالائے اتنا تھوڑا ہے۔

جمہور علماء اُمت نے گہری فکر و نظر اور بے لاگ نقد و تبصرہ کے بعد اس کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری کا عظیم الشان لقب عطا فرمایا ہے۔ صحیح کے علاوہ امام کی کئی اور جلیل القدر تصانیف ہیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں، کتاب ادب المفرد، تاریخ کبیر، کتاب الضعفاء، جامع کبیر، کتاب الرجال، کتاب العلل، کتاب الکنی۔

مدت دراز کے بعد اپنے وطن مالوف بخارا واپس لوٹے۔ اہل شہر نے نہایت شاندار جلوس نکالا اور ان پر روپے اور اشرفیاں نچھاور کیں۔ آپ کئی سال تک بخارا میں حدیث شریف پڑھاتے رہے۔ لیکن بعض بدنہادوں نے ان کے خلاف سازش کی اور والیٔ بخارا کو یہ ترغیب دی کہ وہ امام بخاریؒ کو یہ کہلا بھیجے کہ وہ اس کے ہاں آکر اسے درسِ حدیث دیا کریں۔ امام علم کی اس توہین کو بھلا کب برداشت کر سکتے تھے اسے کہلا بھیجا کہ میں علم کو یوں رسوا نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں سماع حدیث کا شوق ہو تو میری مسجد میں حاضر ہو جایا کرو۔ اس سے وہ بدآموز بگڑ گیا اور آپ کو بخارا سے جلاوطن ہونا پڑا۔ ایک شب سحری کو اٹھے اور بعد نماز تہجد دُعا مانگی۔

اللّٰھمّ قد ضاقت علیّ الارض بما رحبت فاقبضنی الیک۔

الٰہی! زمین کشادگی کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، مجھے اپنی طرف کھینچ لے۔
چنانچہ اسی ماہ میں بیمار ہوئے اور عید الفطر کے روز ۲۵۶ھ میں جنت الفردوس کو سدھارے۔

ابوبکر خطیب اپنی تاریخ بغداد میں نقل کرتے ہیں کہ عبدالواحد طراویسی نے کہا کہ میں نے ایک رات حضور نبی کریم علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خواب میں دیکھا کہ

چند صحابہ کے ساتھ حضورؐ کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں نے سلام عرض
کیا اور پوچھا حضورؐ کس کے منتظر ہیں۔ ارشاد فرمایا انتظر محمد بن اسمٰعیل البخاری
میں محمد بن اسمٰعیل بخاری کا انتظار کر رہا ہوں۔

چند روز گزرنے کے بعد پتہ چلا کہ امام بخاریؒ نے عین اس وقت دار فانی سے
رخت سفر باندھا جس وقت اپنے غلاموں کو فراموش نہ کرنے والا آقا صلی اللہ علیہ وسلم
ان کا منتظر تھا۔ اس شان کریمی کے نثار اور اس ادائے بندہ نوازی پہ قربان!

کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بہ جاں فقط، دو جہاں فدا
نہیں دو جہاں سے بھی جی بھرا، کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

(اعلیحضرت بریلوی)

مدت دراز تک حضرت امام بخاریؒ کے مزار پر انوار کی مٹی سے مشک کی سی
خوشبو آتی رہی اور لوگ تبرک کے طور پر وہ مٹی لے جاتے رہے۔ کیوں نہ ہو ے

ہر جا کہ تو بگزری و برداری پے　　گل روید و لالہ روید اندر تروے

حجۃ الاسلام ابو الحسین مُسلم بن حجاج

آپ نیشا پور کے باشندے ہیں اور اپنے زمانہ کے امام حدیث تھے۔ آپ
تحصیل علم کے لئے دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور وہاں کے علماء کرام سے علم
حدیث حاصل کیا۔ خراسان میں یحییٰ بن یحییٰؒ اور اسحٰق بن راہویہؒ سے، رے میں محمد
بن مہرانؒ، ابی حسان سجقیؒ سے، عراق میں احمد بن حنبلؒ اور عبداللہ بن مسلم قعنبیؒ سے،
حجاز میں سعید بن منصورؒ اور ابی مصعبؒ سے، مصر میں عمرو بن سوادؒ اور حرملہ بن یحییٰ
وغیرہم علماء کبار سے علم حدیث کا درس لیا اور کثیر التعداد لوگوں نے آپ سے علم
حدیث پڑھا۔ آپ کے تلامذہ میں سے ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، ابو عیسیٰ ترمذی
اور ابوبکر بن خزیمہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام مسلمؒ نے بھی امام بخاریؒ کی اقتداء کرتے ہوئے صحیح لکھی اور تین لاکھ
احادیث سے اس کا انتخاب کیا، اس کی ترتیب میں امام مسلمؒ کو پندرہ سال تک
محنت شاقہ کرنی پڑی۔ تب جا کر بارہ ہزار احادیث صحیحہ کا یہ مجموعہ مرتب ہوا۔
کتب احادیث میں صحیح بخاری کے بعد اس کا مقام ہے۔

دار قطنی کہتے ہیں کہ جب امام بخاریؒ آخری عمر میں نیشا پور میں قیام پذیر
ہوئے تو امام مسلمؒ ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے اور خدمت گزاری میں
کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ صحیح مسلم کے علاوہ امام مسلمؒ نے کئی دیگر عظیم المرتبت
کتابیں تصنیف کیں۔

آپ کی پیدائش ۲۰۴ھ میں ہوئی اور ۲۶۱ھ میں دار فانی سے مُلکِ
بقا کو سدھارے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وبجاھہ علینا اجمعین۔

یہ ہیں وہ ائمہ کبار اور نوادر روزگار ہستیاں جن کے علم و فضل، زہد و تقویٰ
دیانت و راست بازی اور خدا و رسولؐ سے والہانہ عقیدت و محبت اور اشاعت
قرآن و سُنّت کے بے مثل جذبہ کا مختصر سا خاکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے جنہوں نے
مختلف اَدوار میں حفاظت و تدوین حدیث کا فرض انجام دیا۔ کیا یہ سب اپنی قیمتی
عمریں کسی بے کار مقصد کے لئے رائیگاں کرتے رہے، کیا انہوں نے (نعوذ باللہ) کذب
و افترا کے دفاتر حضور کریمؐ کی طرف منسوب کر کے اُمّت میں شائع کئے۔ اگر نہیں
اور یقیناً نہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی مساعی جمیلہ سے ارشادات نبویؐ
نہایت صحت سے محفوظ رہے اور انہوں نے اتنی کوششیں اسی اعتقاد کے باعث
کیں، کہ رسالت مآب کے بیان کردہ احکام و فرامین قیامت تک اُمّت کے لئے
آیۂ رحمت اور مایہ فلاح و کامرانی ہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ اگر حضورؐ کا مقصد
یہی تھا کہ حضورؐ کے ارشادات فقط اسی زمانہ کے لئے حجت ہیں اور آئندہ نسلوں

کے لئے ان کی کوئی قانونی اہمیت نہیں تو کیوں اداشناسِ نبوت حضرت فاروق نے احادیث کی اشاعت وتدریس کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ میں فاضل صحابہ کو بھیجا۔ صحابۂ کرام نے ایک ایک حدیث کے لئے مہینوں کا سفر لق ودق صحراؤں میں کیوں اختیار کیا؟ اور کیوں ہزارہا اربابِ علم ودانش نے اپنی عمریں اس کے حصول اور پھر اس کی اشاعت میں صرف کر دیں۔ یہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھے۔ یہ حقیقت ان کے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح تھی کہ اگر احادیث کا یہ قیمتی ذخیرہ تلف ہو گیا تو بندگانِ نفسِ خدا کی آخری کلام کو بازیچۂ طفلاں بنا کر اسلام کی روح کو فنا کر کے رکھ دیں گے اس لئے انہوں نے ہر قیمت پر احادیث کو محفوظ رکھنے کا عزمِ صمیم کر رکھا تھا اور اس میں ان کی کامیابی نے دشمنانِ اسلام کو بھی ان کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن دوسری طرف آج کا مسلمان ہے جو اپنے ایمان کی کمزوری کو طرح طرح کی عذر تراشیوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ بیگانوں کی اداؤں نے اسے ایسا مسحور کر رکھا ہے کہ اس نے محبوبِ کبریا کے جمالِ جہاں آرا سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی کی پیہم پابندی نے اسے جوہرِ عمل سے محروم کر کے سہل انگاری اور تن آسانی کی لعنت میں گرفتار کر دیا ہے۔ یہ کرگسوں میں پلا ہوا بچہ شاہین لطفِ پرواز سے بے خبر ہے۔ یہ حضرات جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ قوم کے ٹھٹھرے ہوئے جذبات اور خفتہ طبیعتوں میں اک آگ سی لگا دیں گے وہ بھی اس کی کوتاہیٔ عمل کو دلائل وبراہین سے تقویت دے رہے ہیں، آج کون ہے جو اس وارفتۂ حسنِ غیر کو یہ کہہ کر چونکا دے ؎

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشا می روی

باب سوم

سنت اور اس کی تشریعی اہمیت

جہاں تک میں نے معترضینِ حدیث کی مشکلات کا اندازہ لگایا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُن کا مطالعہ صرف چند نامکمل تراجم کتبِ حدیث تک محدود ہوتا ہے، وہ ان اصولوں سے بے خبر ہوتے ہیں جن سے کسی حدیث کی فقہی اور قانونی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اس سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں کہ اس حدیث سے جو حکم ثابت ہے وہ فرض ہے، سنت ہے، جائز ہے یا مُباح ہے بلکہ انہوں نے تو احکام کے اس فرق کو جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اور پھر بیچارے وہم وگمان کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں اور اسی طرح اپنے خود ساختہ اوہام میں غلطاں وپیچاں رہتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض تو اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھتے ہیں اور حدیث پر بے جا اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے تو فخرِ کائنات علیہ وآلہٖ افضل التحیات وازکی التسلیمات نے ہمیں یہ دُعا سکھائی اللّٰھم ارنا الاشیاء کما ھی (او کما قال) کہ اے ظاہر وباطن کے واقف ہمیں حقیقتِ اشیاء پر آگاہی بخش تاکہ بے علمی کی وجہ سے بھٹکتے نہ پھریں۔ اللہ تعالیٰ مجھے، آپ کو اور طالبانِ حقیقت کو حقائقِ اشیاء سے آشنا فرمائے آمین، بجاہِ حبیبہٖ الکریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم۔

علمائے امتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علومِ دین کی تحقیق وتفحص میں جو عرق ریزی اور جگر کاوی کی ہے آپ اقوامِ عالم کے دفاترِ علمی میں اس کی نظیر نہیں بتلا سکتے۔ ان کے نزدیک دین صرف روایت کسی نے کر دی، اس کی تقلید فرض ہو گئی۔ بلکہ انہوں نے اس دینِ قیّم کے اصولوں کو جسے رب العزت نے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ

فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا فرمایا ہے۔ روایتِ صحیح کے ترازو میں رکھ کر تولا اور عقلِ سلیم
کی کسوٹی پر پرکھا۔ جب اس کی صداقت میں سرِ مو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تو
اسے نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

پچھلے باب میں میں نے عرض کیا تھا کہ انہوں نے احادیثِ نبوی کو محفوظ رکھنے
کے لئے کیا کیا کوششیں کیں۔ اور انسانی بساط میں وضع و اختلاط کے فتنہ کے سدِباب
کا جہاں تک تعلق ہے اسے کیسے بااحسن وجوہ سر انجام دیا۔ لیکن روایت میں کذب و
افترا، اور سہو و نسیان کا راہ پالینا کیونکہ بعید از قیاس نہیں اس لئے ان کے فکرِ دقیقہ
سنج اور فراست حقیقت شناس نے نفسیاتِ انسانی کا پوری طرح تجزیہ کیا اور جہاں
بھی روایت میں انسان کی نفسیاتی کمزوری یا لغزش کا سراغ ملا، اسے اجاگر کر کے رکھ
دیا۔ ان کا قلمِ حق نگار نہ کبھی ظاہری زہد و تقدس سے مرعوب ہوا اور نہ سطوت و
جلالِ پادشاہی اسے کبھی ہراساں کر سکا۔ ان کے ذہن و قار نے طبیعتِ انسانی
کے پنہاں اسرار کا کھوج لگایا اور جہاں کہیں سقیم دیکھا اسے بے نقاب کر کے چھوڑا۔
ان کے نزدیک حدیث کی صحت کے لئے فقط اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ کسی پارسا
عالم کی زبان سے سُنی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کی صداقت پر عقلِ سلیم کی شہادت
بھی ضروری ہے۔

یہ بحث بہت دلچسپ بھی ہے اور معلومات سے لبریز بھی۔ اس کے مطالعہ
سے آپ کو ایک طرف یہ دیکھ کر مسرت ہوگی کہ آپ کے علماء نے انسانی کردار اور
اس کے اندازِ فکر کا کس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے اور دوسری طرف آپ کو حدیث کے
واجب العمل ہونے کا بھی یقین ہو جائے گا اور شکوک و شبہات کے یہ خوفناک
بادل از خود چھٹ جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

سُنّتِ نبوی کی تشریعی حیثیت کو جاننے کے لئے جن قواعد و اصول کا علم ازحد

اہم ہے ان کے ذکر کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ لفظ سنت کی تشریح
کر دی جائے تاکہ اس لفظ کا مفہوم صحیح طور پر ذہن نشین ہو جائے، جو ہماری ساری
بحث کا مرکز ہے۔

لفظ سُنّت کی تشریح

یہ لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک اس کا لغوی معنی ہے، دوسرا
اس کا وہ معنی ہے جس میں اس کو علماء فقہ استعمال کرتے ہیں اور تیسرا وہ معنی جو
علماءِ اصول کے نزدیک معتبر ہے۔

۱— السنة فی اللغة الطریقة المعتادة محمودة کانت اولا۔

لغت میں سنت اس طریقہ کو کہا جاتا ہے جو عام مروج ہو خواہ اچھا ہو یا بُرا ہو۔

۲— وفی الفقه ما واظب صلی الله علیه وسلم علیٰ فعله مع ترک ما بلا عذر۔

فقہ میں سنت اس فعل کو کہا جاتا ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ہمیشہ کیا ہو لیکن کبھی اسے بغیر کسی عذر کے ترک بھی فرما دیا ہو۔

۳— وفی الاصول قوله علیه السلام وفعله وتقریره مِمَّا لَيْسَ مِنَ الْأُمُورِ الطَّبِيعِيَّةِ۔[1]

علمِ اصول میں سنت کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول اور اس
فعل اور اس تقریر کو جو ان امور سے نہ ہوں جن کا تعلق طبیعتِ انسانی کے ساتھ ہے۔
میرے پیشِ نظر اس وقت صرف سنت کے اس تیسرے معنی سے بحث کرنا ہے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول اور فعل یعنی حضورؐ نے یہ فرمایا اور ایسا کیا
کا مفہوم تو بالکل واضح ہے لیکن تقریر کا لفظ شاید بعض حضرات کے لئے نیا ہو۔

[1] التحریر للامام ابن همام وشرحه التقریر ۲۲۳ ج ۲۔

اس لئے عرض ہے کہ یہ لفظ محدثین کے نزدیک ایک خاص اصطلاحی معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ کے سامنے کسی نے کوئی فعل کیا اور حضورؐ نے اسے اس فعل سے منع نہ فرمایا۔ حضورؐ کے اس منع نہ فرمانے کو تقریر کہا جاتا ہے۔ یعنی اس فعل کو جائز رکھا گیا ہے کیونکہ اگر یہ ناجائز ہوتا تو حضورؐ ضرور اس سے روکتے۔

اس معنی کے "خط کشیدہ الفاظ" پر ذرا نظر ثانی فرمایئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ علماءِ اسلام کے نزدیک سنتِ رسولؐ جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار حکم فرمایا ہے اس سے مراد فقط حضورؐ کے وہ اقوال، وہ افعال اور وہ تقریرات ہیں جن کا تعلق تشریع سے ہے۔ ان کے علاوہ جو اقوال و افعال انسانی طبیعت سے وابستہ ہیں وہ احکامِ تشریعیہ میں داخل نہیں۔

اُمورِ تشریعیہ اور احوالِ طبیعیہ کا فرق

اُمورِ تشریعیہ اور احوالِ طبیعیہ کا فرق سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم شریعتِ اسلامی کی غرض و غایت کو سمجھیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہ شریعت بلا مقصد نہیں۔ وہ حکیم ہے۔ بغیر کسی فائدہ کے حکم نہیں دیتا۔ وہ عادل اور رحیم ہے کسی پر ظلم اس کی شان سے بالکل بعید ہے۔ وہ غنی اور صمد ہے۔ کسی کا حاجت مند نہیں۔ اس کی عبودیت کی مُہر کائنات کی ہر اعلیٰ اور ادنیٰ چیز پر ثبت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا ہر حکم اٹل ہے کوئی چاہے یا نہ چاہے اسے ماننا پڑتا ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویؐ میں یہ صراحۃً بتا دیا گیا ہے اُن تمام احکامِ شرعیہ سے مقصود ہمارے رُوح و نفس کی اصلاح اور ہماری دنیوی اور اُخروی فلاح ہے۔

شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد

اگر آپ احکامِ شرعیہ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، تو آپ کو پتہ چلے گا کہ پانچ ایسی بنیادی چیزیں ہیں جن کی نشوونما اور حفاظت پر ہماری سعادتِ دارین کا دارومدار ہے اور انہیں کے متعلق رحمتِ ربانی نے اپنے محبوب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہماری رہنمائی فرمائی ہے وہ پانچ چیزیں یہ ہیں:

(۱) دین (۲) نفس (جان) (۳) عقل (۴) نسل (۵) مال[1]

دین جو بندے کا رشتہ اپنے خالق و مالک سے قائم اور مضبوط کرتا ہے، اس کے تحت توحید و رسالت و قیامت وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ عبادات کو فرض کیا گیا اور شرک و کفر اور ان کے لوازم سے روکا گیا۔

نفس یعنی حیات ظاہری: مہلت کی وہ گھڑیاں جب کہ انسان اپنے رب کے دیئے ہوئے قوائے عقلی، فکری، حسی اور بدنی کو اس کے رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق بروئے کار لاکر اپنے رب سے اپنی بندگی کا رشتہ محکم کر سکتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے حکم فرمایا اور جو شخص اُسے یا اس کی کسی جزو کو تلف کرنے کی جرأت کرے اس کے لئے قصاص اور دیت کا قانون صادر فرمایا۔

عقل جو انسان کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے بغیر انسان حیوانات سے بھی کمتر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات تو ان سے بھی زیادہ اذیت رساں بن جاتا ہے اس کی حفاظت کے لئے تمام منشّی چیزوں کو حرام کر دیا اور اگر کوئی ان کو استعمال کرے تو اس کے لئے حد مقرر کر دی۔

نسل (انسانی) جس سے بزمِ ہستی کی رونق ہے۔ جس کی بقا کے بغیر

[1] الموافقات لابی اسحٰق الشاطبی ج ۲ ص۱۰۔

قدرت کے بے شمار انعامات اور ان گنت خزانے بے مصرف سے ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کی افزائش کے لئے نکاح کا حکم دیا اور زن و شوہر کی حسنِ معاشرت کے قواعد بنائے۔ زنا سے روکا اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے کوڑوں اور رجم کی عبرتناک سزائیں مقرر کیں۔

مال جس سے یہ ساری کاروباری، صنعتی، معاشی اور عمرانی نشاط وابستہ ہے، اس کے لئے خرید و فروخت وغیرہ کے عادلانہ قواعد سکھلائے اور چوری غصب، سُود اور ناجائز لُوٹ کھسوٹ کرنے سے منع کیا اور دست درازی کرنے والے کے لئے سزائیں مقرر کیں۔

افعالِ نبویؐ

اس چیز کو سمجھ لینے کے بعد اب آپ تشریعی اور غیر تشریعی اُمور کا فرق خود کر سکتے ہیں۔ حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال جن کا تعلق عبادات سے ہے یا ایسی چیزوں کو منع کرنے سے ہے۔ جن سے دین کے اصولوں کو ضعف پہنچتا ہے مثلاً شرک و کفر اور غیر اللہ کے لئے حیوانات ذبح کرنا یا ان سے عقل، جسم، مال اور آبرو کے تلف اور برباد ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یا اُن میں ایسے حقوق مادیہ اور معنویہ کا بیان ہے جن کے ادا کرنے کا ہمیں حکم ہے جیسے وراثت، اقارب کے نفقہ اور میاں بیوی کے حسنِ معاشرت کے احکام یا ایسے حقوق جن کی پابندی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے جیسے معاملات میں اپنے قول کی پابندی وغیرہ۔ ایسے تمام اقوال و افعال تشریعی ہیں اور ان کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے۔

لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایسے اقوال و افعال جن کا تعلق حقوق اللہ یا حقوق العباد سے نہیں اور نہ ہی ان سے ان بنیادی اُمور سے ضرر و فساد کا

ازالہ مقصود ہے یہ اقوال و افعال غیر تشریعی ہیں۔ مثلاً عادات، صناعت، زراعت اور وہ علوم و فنون جن کا دارومدار بحث و تجربہ پر ہے۔ ان امور کے متعلق جو اقوال ہیں اسے علماء کی اصطلاح میں ارشاد کہا جاتا ہے وہ تشریعی نہیں ہے[1]۔

علماءِ اصول نے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کے متعلق بحث کی ہے۔ وہاں صاف لکھا ہے کہ حضورؐ کے افعال تین قسم کے ہیں پہلے وہ افعال جو حضورؐ کی خصوصیات سے ہیں۔ ان میں سے جو حضورؐ کے لئے مباح ہیں وہ ہمارے لئے حرام ہیں مثلاً چار سے زیادہ بیویوں سے نکاح یا صوم وصال یعنی کئی رات دن بغیر افطار کئے روزہ رکھے رہنا اور جو حضورؐ کے لئے واجب ہیں وہ امّت کے لئے مُباح ہیں مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر تہجد کی نماز فرض تھی تو امّت کے لئے مُباح ہے فرض نہیں ہے[2]۔

دوسرے وہ افعال ہیں جن کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔ نشست و برخاست، خورد و نوش اور چلنا پھرنا وغیرہ جن کا تعلق عبادات سے نہیں۔ ان افعال کی پابندی اُمت پر فرض نہیں۔ اگر ایسا کریں تو مباح ہے۔

تیسرے وہ افعال ہیں جن سے مقصود احکامِ الٰہی کا بیان اور وضاحت ہے۔ جن کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد سے ہے[3] ان افعال کا اتباع اور اطاعت اُمّت پر فرض ہے۔ اور یہی سُنّت تشریعی ہے جس کے متعلق ہم آیندہ بحث کریں گے۔

منکرینِ سنتِ مصطفوی کو سنت کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لئے یا تو واقعی فرصت نہیں ملی، یا وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں ورنہ وہ یہ اعتراض نہ کرتے کہ

---

۱ المنار، ج ۹ ص ۳۰۳۔ ۲ ارشاد الفحول للشوکانی ص ۳۵

۳ الاحکام اللہ مدی ج ۱ ص ۸۹۔

علماء نے تو زمانۂ نبوت کے روزمرّہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو بھی دین بتا دیا ہے اور وہ لوگوں کو سنتِ نبوی کی اطاعت سے یہ کہہ کر متنفر کرنے کی کوشش نہ کرتے کہ اتباعِ سنت کا مطلب تو یہ ہے کہ فقط جَو کی روٹی کھاؤ۔ کھردا کپڑا پہنو، لکڑی اور مٹی کے بنے ہوئے برتن استعمال کرو اور ایسے ہی مکانات میں سکونت اختیار کرو جن کی چھتیں کھجور کی شاخوں کی ہوں وغیرہ وغیرہ ورنہ تم ان علماء کے نزدیک کبھی سچے مسلمان نہیں بن سکتے۔

علماء اسلام کی نظر میں سنّت کا جو مفہوم ہے وہ آپ نے پڑھ لیا۔ اس کے بعد ایسے شبہات کے ازالہ کی میں ضرورت نہیں سمجھتا جو ان حضرات کی طرف سے دانستہ یا نادانستہ لوگوں کو سنت نبویؐ کی اطاعت سے روکنے کے لئے آئے دن پیش کئے جاتے ہیں۔

رسالت مآبؐ کے اعمالِ طبیعیہ کی پابندی

اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عاداتِ کریمانہ ہمارے لئے اس معنی میں شرع نہیں کہ ہم ان کی پابندی پر مجبور ہوں اور اگر ان کے خلاف دوسری عادات کو اپنائیں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نافرمان کہلائیں لیکن اس کے باوجود جن سعادت مندانِ ازلی کو ذوقِ محبت کی لذّتوں سے آشنا کیا گیا ہے ان کی سیرتیں تو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہر بات میں اپنے محبوب اکرمؐ کے اتباع کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت تصوّر کرتے تھے اور ان کی یہ انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو حضورؐ کے کسی عمل کے خلاف ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تو یہ حالت تھی۔

وکان شدید الاتباع لاثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حتی انه ینزل منازله ویصلی فی کل مکان صلی فیه ویبرك ناقته فی مبرك ناقته۔ ونقلوا ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نزل تحت شجرة فکان ابن عمر یتعاهدها بالماء۔[1]

کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے اتباع کا بھی ازحد خیال رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر سفر کرتے تو اُسی جگہ راستہ میں قیام فرمایا ہوتا اور جس مکان پر حضورؐ نے نماز ادا فرمائی وہاں نماز ادا کرتے اور جس جگہ حضورؐ کی اونٹنی بیٹھی اسی جگہ پر اپنی اونٹنی کو بٹھاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا۔ اس کو ہمیشہ پانی دیتے تاکہ وہ (درخت جس سے ان کے محبوب کی دلنوازیاد وابستہ ہے) ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔

اسی طرح اگر ان اولوالعزم ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے جو بغیر کسی مادی سہارے اور بغیر کسی حکومت کی پشت پناہی کے دنیا کے گوشہ گوشہ میں توحید کا پیغام لے کر پہنچے اور جہاں گئے وہاں اسلام کا پرچم یوں گاڑا کہ پھر اسے کوئی طاقت اکھیڑ نہ سکی۔ ان اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی اگر آپ پڑھیں تو ہر بات میں اتباعِ رسالت کی شیفتگی دیکھ کر آپ حیران ہو جائیں گے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری عمر میں اس لئے خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ کو کس طرح تناول فرمایا ہے۔ شاید آپ کو اتباع کا یہ انداز پسند نہ آیا ہو۔ لیکن اس کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے واقفِ اسرارِ خودی و شارحِ رموزِ بےخودی علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا قولِ فیصل سن لیجئے۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق   ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

[1] تہذیب الاسماء للامام النووی ج ۱ ص ۲۷۹۔

کاملِ بسطام در تقلید فرد — اجتناب از خوردن خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار — تا کمند تو شود یزداں شکار

چاہئے تو یہ تھا کہ ہم الحاد و مادیت اور اباحیت و اخلاق باختگی کی تاریکیوں میں مشکوٰۃِ نبوت سے زیادہ سے زیادہ اکتسابِ نور کرتے تاکہ خود بھی راہِ حق سے نہ بھٹکتے اور دوسروں کو بھی ان اندھیروں سے باہر نکلنے کا راستہ دکھاتے لیکن شومیٔ قسمت اس اُمّت میں ہی ایسے حضرات بھی ہیں جو ہمیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ سنّت نبوی کی یہ قندیلِ فروزاں جو تم نے اٹھا رکھی ہے۔ اسے گل کر دو۔ آج کل تو تاریکی کا دور دورہ ہے۔ اپنے زمانہ کا ساتھ دو، ورنہ دنیا تمہیں کہے گی یہ غیر مہذب ہیں، یہ غیر متمدن ہیں یہ اس عہدِ رفتہ کے آثارِ قدیمہ ہیں جب کہ فاران کی چوٹیوں سے ایک آفتاب ابھرا تھا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا تھا۔ اور وادی وادی تجلیات ربانی سے پُرنور ہو گئی تھی۔

اقسامِ سُنّت

سنت کی تعریف سمجھ لینے کے بعد اب اس کے اقسام سنئے:

سُنّت مسند۔ ایسی حدیث کو کہتے ہیں، جس کے تمام راوی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک مذکور ہوں اور کوئی راوی متروک نہ ہو۔ احناف کے نزدیک سنت مسند تین قسم ہے (۱) خبر متواتر (۲) خبر مشہور یا مستفیض اور (۳) خبر واحد۔

اب آپ ان کی تعریفیں سنئے، ان کے احکام اور ان سے ثابت شدہ اُمور کی آئینی اہمیت ملاحظہ فرمائیے یقیناً آپ شکر و امتنان کے جذبات سے سرشار ہو کر بارگاہ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کریں گے جس نے اپنے محبوب کی امت کو ایسے علمائے سے نوازا۔

تعریف خبر متواتر

خبر متواتر کہتے ہیں:۔

ما یکون رواتہ فی کل عھد قوما لا یحصی عددھم ولا یمکن تواطئھم علی الکذب لکثرتھم و عدالتھم وتبائن اماکنھم (توضیح جلد ثانی)

ہر وہ حدیث جس کو ہر زمانہ میں ان گنت راویوں نے روایت کیا ہو اور اُن کا جھوٹ پر متفق ہو جانا بوجہ ان کی کثرتِ تعداد کے بوجہ ان کی دیانت اور راستبازی کے اور بوجہ ان کے وطنوں کے مختلف ہونے کے ناممکن ہو۔

آپ انصاف سے کہیں کہ اگر کثیر التعداد پاکباز لوگ جن کے سامنے کوئی مفاد مشترک بھی نہ ہو۔ کسی واقعہ کی خبر دیں تو آپ کو اس کا یقین نہیں آجائے گا؟ قطعاً آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا۔ اور آپ کی عقل اس کی صحت تسلیم کرے گی۔

جو احادیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں کسی عقلمند کو ان سے انکار کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے علمائے فرمایا ہے کہ ایسی حدیث علم یقین کا فائدہ دیتی ہے اس سے جو حکم ثابت ہوگا قطعی ہوگا۔

اور سنئے قرآن کریم کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو اس نے سرورِ عالم محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو آج سے پونے چودہ سو سال پہلے حضورؐ پر نازل ہوا تو آپ اسے یہی کہیں گے کہ ہر زمانہ میں کثیر التعداد لوگ اسے اسی نظم و ضبط کے ساتھ نقل کرتے آئے ہیں۔ اور خدا کی بے شمار مخلوق جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتی۔ بعینہٖ یہی دلیل ہم ان احادیث کے متعلق دیتے ہیں جو نبی اکرم سے تواتراً ثابت ہیں۔

ثابت ہوا کہ روایت بالتواتر حصولِ علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کسی

چیز کا علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پانچ نمازوں کی فرضیت، رکعتوں کی تعداد، شرح زکوٰۃ یا اس قسم کے اور امور شرعیہ جو تواتر روایت اور تواتر عمل سے ثابت ہیں، یہ قطعی اور یقینی ہیں۔

حدیث متواتر کے لئے راویوں کی کسی مخصوص تعداد کی شرط کی ضرورت نہیں صرف اتنی تعداد کافی ہے کہ عقل ان کے کذب پر متحد ہوجانے کو مستحیل جانے۔ اگر راوی بہت راستباز، متدین اور خدا سے ڈرنے والے ہوں تو اگر ان کی تعداد نسبتاً کم بھی ہو تو ہمیں علم یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے۔ کیونکہ ان سب کا بایں ہمہ زہد وارتقاء جھوٹ پر یوں متحد و متفق ہوجانا عقلاً محال ہے۔

بعض لوگ بے سوچے سمجھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضرت! ایسی حدیث جو ان اوصاف سے متصف ہو کوئی ایک آدھ مشکل سے ملے گی۔ لیکن ان کا یہ خیال ان کے محدود مطالعہ کی غمازی کرتا ہے۔ کیونکہ اگر احادیث کی تمام مشہور کتابوں میں جن کے متعلق ہمیں پورا وثوق ہے کہ ان کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف درست ہے۔ متفقہ طور پر ایک حدیث مرقوم ہو اور ہر ایک کا سلسلہ سند بھی جدا جدا ہو تو ایسی حدیث بھی بلاشبہ علم یقینی کا فائدہ دے گی کیونکہ تمام ائمہ حدیث کا ایک جھوٹی حدیث پر جو متعدد سلاسل سے مروی ہے یوں متفق ہوجانا عقلاً محال ہے اور ایسی احادیث کتب میں کثرت سے موجود ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم)

خبر مشہور

اس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

المشہور ما کان من الآحاد فی الاصل ثم انتشر فصار ینقلہ قوم لایتوہم تواطئہم علی الکذب وہم القرن الثانی ومن بعدہم۔

حدیثِ مشہور وہ ہے جس کو حضور علیہ السلام سے تو فقط ایک یا دو صحابہ نے روایت کیا ہو لیکن صحابہ سے اور ان کے بعد اتنے لوگوں نے روایت کیا ہو کہ ان کا کذب پر اجتماع عقلاً ناممکن ہو۔

گویا صحابی تک تو مشہور و تواتر میں کوئی فرق نہیں، لیکن کیونکہ صحابہ کی تعداد کثیر نہیں، اس لئے اس کا درجہ متواتر سے کم ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ علمِ یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔ ہاں اس سے علم طمانیت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی دل اس کی صداقت پر اور مروی عن رسول اللہؐ ہونے پر بالکل مطمئن ہوجاتا ہے اور اس کی صحت کو تسلیم کرنے میں کوئی تذبذب نہیں پایا جاتا، کیونکہ صحابہ کرام کے متعلق ہمیں پورا وثوق ہے کہ وہ سرکارِ دوعالمؐ کی طرف جھوٹ منسوب نہیں کیا کرتے تھے۔

ذرا دیکھئے علماء کرام کی اصول پرستی۔ صحابہ کرام کی راستبازی مسلّم لیکن کیونکہ ایک حدیث کو صحابہ کی کثیر تعداد روایت کرتی ہے اور دوسری حدیث کو ایک یا دو صحابہ روایت کرتے ہیں۔ اس لئے دوسری حدیث اثباتِ حکم میں پہلی حدیث (متواتر) کے مساوی نہیں ہوسکتی۔

اس کا اثر کیا ہوا؟ اثر یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص حدیثِ مشہور کا منکر ہوگا تو ہم اسے گمراہ اور ضال تو کہیں گے لیکن اسے کافر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس سے جو حکم ثابت ہوگا وہ واجب العمل ضرور ہوگا۔

خبر واحد

یہ بحث بہت اہم ہے کیونکہ اکثر احادیثِ نبویؐ جو ہم تک پہنچتی ہیں، وہ اخبار آحاد ہیں۔ کتبِ اصول میں اس کے متعلق بہت طویل گفتگو کی گئی ہے اور مختلف اقوال و آراء نقل کئے گئے ہیں جن میں اگر پوری طرح غور نہ کیا جائے تو

حقیقت ان علمی لیکن پیچیدہ ابحاث میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان کو ذہنی
پریشانی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس کو
کچھ تفصیل اور ایک ترتیب سے ذکر کروں گا اور اپنے قارئینِ کرام سے درخواست
کروں گا کہ وہ اسے اپنے غور و فکر کا مستحق سمجھیں، اور اگر ذرا طوالت محسوس کریں
تو اُکتائیں نہیں۔ اس کو پڑھ لینے اور سمجھ لینے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وہ اعتراف
کریں گے کہ ان کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔

آئیے اس بحث کو چند حصوں میں تقسیم کرلیں تاکہ اسے سمجھنے میں سہولت رہے۔

۱۔ 'خبر' کی تعریف اور اس کے اقسام

۲۔ 'خبرِ واحد' کی تعریف

۳۔ 'ظن' کے معانی کی تحقیق

۴۔ 'خبرِ واحد' کے واجب الاتباع ہونے کے عقلی دلائل

۵۔ 'خبرِ واحد' کے واجب الاتباع ہونے کے نقلی دلائل

۶۔ قیاس اور خبرِ واحد

۱۔ (ا) علماء نے خبر کی کئی تعریفات ذکر کیں۔ لیکن مجھے ان میں سے
سب سے زیادہ صحیح وہ تعریف معلوم ہوتی ہے جو امام رازیؒ نے المحصول میں
ابوالحسین بصری سے نقل کی ہے:۔

انه کلام مفید بنفسه اضافة امر من الامور الی امر
من الامور نفیا او اثباتا۔

یعنی خبر ایسے کلام کو کہا جاتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کوئی چیز
کسی دوسری چیز کے لئے ثابت ہے یا نہیں۔

مثلاً خالد پڑھتا ہے سے پڑھنا خالد کے لئے ثابت ہے۔ اور خالد روتا نہیں

ہے، سے رونے کی خالد سے نفی کی گئی۔

اس خبر کی تین قسمیں[1] ہیں (۱) جس کے سننے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ یہ
خبر صحیح ہے اور اس میں جھوٹ کا گمان تک نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اقوال،
اس کے رسولؐ کے ارشادات، اور وہ خبر جو تواتر سے ثابت ہو۔ مثلاً دُور
افتادہ ممالک اور ان کے مشہور شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے نام۔ یا
گزشتہ زمانہ کی وہ تاریخی ہستیاں جن کے وجود پر ان گنت لوگ ہر زمانہ میں
شہادت دیتے آئے ہیں۔

(۲) جس کے سننے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہے، اس میں صداقت
کا ادنیٰ احتمال تک نہیں۔ مثلاً جو چیز عقل، حس، مشاہدہ اور اخبار متواترہ کے خلاف
ہو۔ یا کتاب اللہ اور سنت متواترہ کی کسی نص کے مخالف ہو۔ وغیرہ

(۳) جس کے صرف سننے سے ہم اس کے صدق و کذب کا فیصلہ نہ کرسکیں
بلکہ اس کی تصدیق و تکذیب کے لئے دوسرے قرائن و شواہد کی ضرورت ہو۔ اگر
ایسے قرائن پائے جائیں جو اس خبر کے صادق ہونے کی تائید کریں تو ہم اسے
صادق کہیں گے اور اگر ایسے شواہد پائے جائیں جو اس کے کاذب ہونے کی
تائید کریں تو ہم اسے کاذب کہیں گے۔

اس قسم میں اور پہلی دو سابقہ قسموں میں یہ فرق ہے کہ وہاں خبر کو فقط سننے
سے ہم اس کی تصدیق و تکذیب قطعی طور پر کرسکتے تھے۔ لیکن یہاں فقط اس خبر
کا سن لینا اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں بلکہ قرائن و شواہد کی تائید
کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا آئے دن ہمیں اپنی
عملی زندگی میں تجربہ ہوتا رہتا ہے۔

[1] المستصفی للامام الغزالی ج ۱ ص ۹۰۔

خبر واحد کی تعریف

یہ تعریف اور تقسیم مطلق خبر کی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ خبر دینے والا کون ہے۔ اب اپنے موضوع (خبر واحد) کی طرف التفات فرمائیے۔ یہ لفظ علماء حدیث کے نزدیک ایک مخصوص اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور وہ معنی یہ ہے۔

خبر الواحد ھو الذی یرویہ الواحد او الاثنان فصاعدا بعد ان یکون دون المشھور والمتواتر۔

ترجمہ:۔ خبر واحد اس حدیث کو کہا جاتا ہے جسے ایک راوی نے یا دو راویوں نے یا دو سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہو۔ لیکن ان کی تعداد حدیث مشہور ومتواتر کے راویوں سے کم ہو۔

خبر واحد کی یہ تعریف سن لینے کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ خبر کی مندرجہ بالا تین اقسام میں سے کون سی قسم ہے۔ ایسی روایت کو سن کر ہم اس کی قطعی طور پر نہ تصدیق کر سکتے ہیں نہ تکذیب۔ اس لئے یہ تیسری قسم میں سے ہے، جس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں قرائن وشواہد کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے قرائن موجود ہوں جو اس کی صداقت پر دلالت کرتے ہوں۔ تو یہ صادق ہوگی اور اگر اس کے خلاف ہوں تو یہ خبر کاذب ہوگی۔

اب جب ہم کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا جو قول یا فعل یا تقریر ہمیں "خبر واحد" کے ذریعہ سے پہنچی ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے تو ہمیں ان قرائن وشواہد کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے جن کا پایا جانا علماء اسلام نے خبر واحد کے واجب الاتباع ہونے کے لئے بطور شرط مقرر کیا ہے۔

خبر واحد کے شروط

ان شرائط کو ذرا غور سے دیکھئے۔ جس خبر واحد میں یہ شرائط پائی جائیں، کیا

اس کی صداقت میں کچھ شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے؟

اسی لئے تو حضرت امام احمد بن حنبل، داؤد ظاہری اور چند دیگر محدثین نے کہہ دیا کہ ان الاخبار التی حکم اھل الصنیعۃ بصحتھا یوجب علم الیقین۔[1]

ترجمہ:۔ وہ اخبار آحاد جن کی صحت کے متعلق فن حدیث کے ماہرین نے فیصلہ کر دیا ہو۔ وہ علم یقین کا فائدہ دیتی ہے۔

وہ آٹھ شرائط ہیں جو اگر خبر واحد میں پائی جائیں تو اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے ان میں سے چار ایسی ہیں جو حدیث کے راوی میں پائی جانی چاہئیں اور چار ایسی ہیں جو متن حدیث میں پائی جانی چاہئیں۔ وہ چار شرطیں جن کا راوی میں موجود ہونا ضروری ہے یہ ہیں (۱) عقل (۲) عدالت (۳) ضبط (۴) اور اسلام۔

ان کی مجملاً وضاحت کئے دیتا ہوں۔

(۱) **عقل** یعنی بلوغ: اس لئے بچے کی حدیث مقبول نہیں ہوگی کیوں کہ وہ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچا۔ اس میں صحیح وغلط کی تمیز اور ادا مرام کی پوری صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح اگر بالغ ہونے کے بعد اس کی عقل کسی بیماری یا صدمہ سے ماؤف ہوگئی، خواہ بالکل ہوش وحواس کھو بیٹھے یا معتوہ ہو یعنی گاہے ہوشیاروں کی سی باتیں کرتا ہے اور گاہے دیوانگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کی حدیث بھی معتبر نہ ہوگی۔

(۲) **عدالت**: علامہ خضری نے "اصول الفقہ" میں اس کی یوں وضاحت کی ہے:

العدالۃ ملکۃ تحمل علی ملازمۃ التقوی والمروۃ وادناھا ترک الکبائر ولاصرار علی الصغائر وترک مایخل بالمروۃ۔[2]

۱؎ کتاب التحقیق، باب السنۃ۔ ۲؎ اصول الفقہ ص ۲۷۱۔

ترجمہ:۔ عدالت وہ قوتِ راسخہ ہے جو تقویٰ اور مروّت کو انسان کی فطرتِ ثانیہ بنادے اور اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان گناہ کبیرہ کو چھوڑ دے اور صغیرہ گناہوں پر بھی مصر نہ ہو (یعنی اگر اس سے گناہِ صغیرہ صادر ہوجائے تو فوراً توبہ کرے اور آیندہ اس سے بچنے کا ارادہ پختہ کرلے) اور اس سے خلافِ مروّت کوئی حرکت صادر نہ ہو۔

خلافِ مروّت حرکات کون کون سی ہیں۔ علامہ خضری نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

فھو الامور الدالة علیٰ خسة النفس من الصغائر والمباحات التی استھجنتھا العادات کالافراط فی المزاح المفضی الی الاستخفاف بہ وصحبة السفلة۔[1]

ترجمہ:۔ خلافِ مروت وہ اُمور ہیں جو انسان کی دوں ہمتی، ذلّتِ نفس اور سفلگیٔ طبع پر دلالت کرتے ہیں۔ خواہ وہ صغائر ہوں یا ایسی مباحات جنہیں عادتاً بُرا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ایسی ظرافت جو انسان کو دوسروں کی نظروں میں گرادے یا اخلاق باختہ لوگوں کی ہمنشینی۔

(۳) **ضبط**: یعنی اس کی قوتِ حافظہ قوی ہو۔ اس کا پتہ تجربہ اور شہرت سے لگتا ہے، اگر اس کی قوتِ حافظہ لوگوں میں مشہور ہے اور اس کی روایات ان لوگوں کی روایات کے موافق ہیں۔ جن کی قوتِ یادداشت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس کا ضبط قابلِ اعتماد ہے اور ضبطِ حدیث کے یہ لوازم ہیں۔

ان یتوجہ الراوی بکلیة الی کل الخبر عند سماعہ ثم حفظہ

[1] اصول الفقہ ص ۲۷۱۔

بتکریرہ ثم الثبات علیہ الی الاداء۔

یعنی راوی اپنے استاذ سے سنتے وقت اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو۔ پھر اسے بار بار دہرانے سے یاد رکھا ہو۔ اور پھر وہ حدیث بیان کرنے تک اسی حالت پر ثابت قدم رہا ہو۔

اگر راوی نے صحیح الضبط ہونے کے باوجود حدیث کو پورا نہیں سُنا یا سُنا تو تھا لیکن بار بار دہرانے سے یاد نہیں رکھا۔ یا، یاد تو رکھا لیکن بیان کرتے وقت ثبات نہیں رہا۔ تو وہ حدیث بھی غیر مقبول ہوگی۔

(۴) **اسلام**: ان اوصاف کے پائے جانے کے باوجود وہ مسلمان نہیں تو اس کی حدیث بھی معتبر نہ ہوگی۔ کیونکہ اُمورِ دین میں کافر کا کیا اعتبار۔ اور اسلام سے مراد وراثت میں ملا ہوا اسلام نہیں کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے، ختنہ ہوگیا اور بس اسلام مکمل ہوگیا۔ نہ ضروریاتِ دین کا علم اور نہ احکام اسلام کا تصوّر۔ بلکہ اسلام علیٰ وجہ البصیرت مراد ہے اور اس کی علامت یہ ہے۔

ان یصف اللہ تعالیٰ کما ھو علی سبیل الاجمال وان لم یقدر علیٰ تفصیلہ وان یصدق بجمیع ما یجب تصدیقہ من الرسالة وامور الآخرة وغیرھا۔[1]

یعنی اللہ تعالیٰ کے اوصاف کا اجمالی علم رکھتا ہو۔ خواہ انہیں تفصیل سے بیان کرنے پر قادر نہ ہو اور تمام ان اُمور کی تصدیق کرے جن کی تصدیق کرنی لازمی ہے یعنی رسالت قیامت وغیرہ وغیرہ۔

اب ان چار شرائط کی تفصیل سنئے جن کا متن حدیث میں پایا جانا ضروری ہے۔

[1] کتاب التحقیق، باب السنة۔

١- ان لا یکون مخالفا للکتاب۔

یعنی وہ حدیث قرآن حکیم کی کسی آیت کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی ایسی خبر واحد، ہوئی جو کسی آیت کے خلاف ہو تو غور کریں گے۔ اگر اس کا کوئی ایسا مصداق بغیر تکلف مل جائے جس سے یہ تضاد اُٹھ جائے تو اس خبر واحد کو اس مصداق پر محمول کریں گے۔ اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو وہ خبر واحد بالاتفاق متروک اور ناقابلِ عمل ہوگی۔

٢- ان لا یکون مخالفا للسنة المشھورة۔

دوسری شرط یہ ہے کہ خبر واحد کسی خبر مشہور کے مخالف نہ ہو۔ اگر کوئی ایسی خبر واحد ہوئی جو خبر مشہور کے مخالف ہو اور ان میں تطبیق کا امکان بھی نہ ہو تو اسے بھی چھوڑ دیں گے۔

٣- ان لا یکون فی حادثة تعم البلوی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ خبر واحد ایسے مسائل سے متعلق نہ ہو جن کا وقوع عام ہوتا ہے اور ہر شخص اس کے جاننے کے لئے مضطر ہوتا ہے۔ اگر خبر واحد میں ایسا حکم ہوا جسے جاننے کے لئے عوام الناس محتاج ہوں، تو وہ خبر بھی متروک ہوگی۔ کیونکہ اس حکم کی طرف عوام کا احتیاج اس امر کا مقتضی ہے کہ یہ حدیث مشہور ہوتی اور اسے ہر شخص جانتا۔ اب اگر ایسا نہیں تو ہم سمجھیں گے کہ یا تو حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لئے لوگوں نے اس کا جاننا ضروری نہ سمجھا اور اس طرح یہ روایت محدود ہوگئی یا راوی کو غلط فہمی ہوگئی۔

٤- ان لا یکون متروك المحاجة عند ظھور الاختلاف۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ صحابہ کا آپس میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہوا ہو اور کسی نے باوجود اس خبر کے جاننے کے اس خبر کو بطور حجت اور دلیل پیش نہ کیا ہو۔

اس صورت میں بھی وہ خبر واحد ترک کر دی جائے گی، کیونکہ صحابہ کا اس طرح اس حدیث سے اغماض کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

لیکن ایسی حدیث جس کے تمام راوی عقل، عدالت، ضبط اور اسلام کی اوصاف سے (جن کا ذکر ابھی گزر چکا ہے) متصف ہوں اور جس کا متن ان تمام علائق سے پاک ہو۔ عقل سلیم کو اس کے واجب العمل ہونے میں قطعًا تامل نہیں ہوگا۔

خبر واحد کا حکم

ان جملہ شرائط کے پائے جانے کے باوجود جمہور علماء کے نزدیک خبر واحد سے جو علم ہمیں حاصل ہوگا وہ یقین نہیں ہوگا، بلکہ ظن ہوگا۔ اگرچہ بعض کے نزدیک ایسی خبر واحد یقین کا فائدہ دیتی ہے جیسے اس سے پہلے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کر چکا ہوں۔

منکرینِ سنتِ نبوی ؐ جب جمہور علماء کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ خبر واحد یقین کا نہیں بلکہ ظن کا فائدہ دیتی ہے اور اس کے باوجود اس پر عمل کرنا ضروری ہے تو ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں کہ مُلّا امت کو ظن کی اطاعت پر مجبور کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن نے بارہا ظن کے اتباع سے منع کیا ہے اور پھر آیتوں پر آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ سُننے والا ابتدا میں تو ان تابڑ توڑ حملوں سے بوکھلا سا جاتا ہے اور یہ سوچنے لگتا ہے کہ واقعی علماء نے آج تک امت کو غلط راستے پر چلایا۔ اور اپنے جبّوں اور عماموں کی آڑ میں لوگوں کو قرآن مجید کی پیروی سے روکا۔ کیا قرآن آج تک نہ سمجھا گیا اور نہ اس پر عمل کیا گیا۔ اس کے سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے صرف اب پیدا ہوئے ہیں؟

آیئے خالی الذہن ہو کر اس مسئلہ پر غور کریں۔

لفظ ظن کی تحقیق

اتنی بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہر زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے اصلی معنی کچھ اور ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال ایک خاص معنی میں ہوتا ہے یا وہ اپنے کئی معنوں میں سے کسی ایک میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ضلعدار، اس کا اصلی معنی ہے ضلع کا افسر لیکن اب ہمارے ہاں (پنجاب میں) ضلعدار محکمۂ انہار کے ایک معمولی افسر کو کہا جاتا ہے یا مثلاً صوبہ دار، اس کا اصلی معنی ہے صوبہ کا والی (گورنر) لیکن اب صوبہ دار ایک فوجی عہدہ دار کو کہتے ہیں جو حوالدار اور سب لفٹیننٹ کے درمیان ہوتا ہے۔

اگر آپ کسی فارسی کی کتاب یا پرانی تاریخی کتاب میں یہ الفاظ پڑھیں جہاں انہیں اپنے اصلی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور آپ اُن سے وہ معانی اخذ کریں جو اب آپ کے ذہن میں ہیں تو کیا یہ ان الفاظ کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا؟

اسی طرح لفظ 'ظن' علم اصول اور علم منطق میں جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے ایک خاص مفہوم مراد ہوتا ہے اور یہی لفظ عربی زبان میں کئی دیگر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اب اگر ہم اس کا ایک معنی ہر جگہ چسپاں کرنے لگیں اور سیاق وسباق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح معنی متعین نہ کریں تو ہم ان عبارات کو سمجھنے میں جہاں لفظ ظن مستعمل ہے، جتنی ٹھوکریں کھائیں کم ہیں اور جتنی غلطیاں کریں تھوڑی ہیں۔

پہلے ایک مثال کے ذریعہ آپ کو ظن کا وہ مفہوم عرض کرتا ہوں جو علماء اصول اس لفظ کے استعمال کرنے سے مراد لیتے ہیں۔ آپ کو پتہ چلا "ارشد پاس

ہو گیا ہے" یہ خبر اگر آپ کو ایسے ذرائع سے ملی جن کی صحت شک وشبہ سے بالاتر ہے تو آپ کو ارشد کی کامیابی کا یقین ہو جائے گا۔ اور اگر ایسے ذرائع سے نہیں پہنچی اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ارشد نے حساب کا امتحان ہی نہیں دیا تو آپ اس خبر کو قطعاً کاذب کہیں گے اور اگر ارشد نے امتحان مکمل دیا ہے لیکن وہ نالائق اور کم کوش تھا تو اس وقت اگرچہ آپ اس خبر کی قطعی تکذیب نہیں کر سکتے تو تصدیق بھی نہیں کر سکتے۔ اسے شک کہتے ہیں۔ جبکہ اس کی کامیابی اور ناکامی کے دونوں احتمال مساوی ہیں۔ اور اگر وہ ذہین اور محنتی تھا اور پرچے بھی تسلی بخش کئے تھے تو آپ کو اگرچہ قطعی ذرائع سے اس کی کامیابی کا علم نہیں ہوا۔ لیکن آپ کا اغلب خیال یہی ہوگا کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے اگرچہ یہ احتمال باقی ہے کہ یہ تار یا خط غلط ہو یا گزٹ میں اس کا نام غلطی سے لکھ دیا گیا ہو۔

ایسی حالت کو جب خبر کی تکذیب کی ہمارے پاس کوئی مادی دلیل نہ ہو اور قرائن وشواہد بھی اس کی صحت پر دلالت کریں، ایسی حالت کو ظن کہا جاتا ہے، چنانچہ آپ کو یہ تصریح ملے گی:

الظن الاعتقاد الراجح مع احتمال النقیض۔

یعنی ظن اُس اعتقاد کو کہتے ہیں جس کی صحت کا پہلو وزنی ہو۔ اگرچہ اس کے غلط ہونے کا احتمال باقی ہو۔

ظن کے متعدّد معانی

لیکن جہاں بھی آپ 'ظن' کا لفظ دیکھیں وہاں آپ یہ معنی چسپاں نہیں کر سکتے، کیونکہ لغتِ عرب میں یہ علم، یقین، شک، وہم اور تہمت وغیرہ کے معانی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب تاج العروس لکھتے ہیں:

وفی البصائر وقد ورد الظن فی القرآن مجملاً علی اربعة
اوجه بمعنی الیقین وبمعنی الشك وبمعنی التھمة
وبمعنی الحسبان ثم ذکر الآیات وجزم اقوام بانه من
الاضداد کما فی شرح الفصیح[1]۔

ترجمہ: "بصائر (لغت کی ایک معتبر کتاب) میں ہے کہ قرآنِ کریم میں لفظ 'ظن' چار معنوں میں استعمال ہوا ہے اور وہ معانی یہ ہیں (۱) یقین (۲) شک (یعنی جب ایک چیز کے ہونے نہ ہونے کے دونوں احتمال مساوی ہوں اور کسی کو ترجیح نہ دی جا سکے) (۳) تہمت اور (۴) حسبان (وہم وگمان) پھر آیاتِ قرآنی سے استشہاد پیش کئے ہیں۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ یہ اضداد سے ہے (یعنی مختلف اور متضاد معانی میں استعمال ہوتا ہے)"۔
اس امر کو واضح کرنے کے لئے لفظ 'ظن' ان مختلف معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۴۹)

ترجمہ: ان لوگوں نے جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے (قیامت کے روز) ملاقات کریں گے، کہا، اللہ تعالیٰ کے اذن سے کئی قلیل التعداد جماعتیں کئی کثیر التعداد جماعتوں پر غالب آئیں۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
یہاں ان مٹھی بھر سرفروش مجاہدوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو حضرت طالوت

[1] تاج العروس فصل الظاء من باب النون۔

کے ہمراہ جالوت کے لشکرِ جرار سے نبرد آزما ہونے کے لئے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان، ان کی شجاعت اور راہِ حق میں کٹ مرنے کی بے تاب آرزو کا ذکر فرماتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ قال جنود طالوت کہ طالوت کے لشکر نے ایسا کہا بلکہ ان کا تعارف صلہ سے کرایا جس سے مقصد ان کی وصفِ خاص بیان کرنا ہے اور ان کی اس دلیری اور شوقِ شہادت کی بے چینی کی وجہ بتانا ہے کہ وہ باوجود تعداد میں بالکل کم ہونے کے کیسے جالوت کی ان گنت فوج کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ فرمایا وہ اس لئے اتنے جری اور بے دھڑک تھے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اور اس وقت ان کی سرفروشی کا پورا معاوضہ انہیں مل جائے گا۔
اس آیت میں یظنون کا لفظ مذکور ہے۔ اگر ہم اس کا یہ معنی کریں کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وہم وگمان رکھتے ہیں تو کیا یہ صحیح ہوگا؟ ایک مؤمن بھی اس وقت تک صحیح مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں، جب تک اسے قیامت کا کامل یقین نہ ہو۔ چہ جائیکہ ہم ان مجاہدین کے متعلق یہ خیال کریں کہ انہیں قیامت کا یقین نہیں تھا بلکہ وہم وگمان (ظن) تھا۔ تو معلوم ہوا کہ اس آیتِ کریمہ میں 'یظنون' کا لفظ جو مستعمل ہے اس کا معنی یقین ہے۔ اسی لئے ابو عبداللہ القرطبی نے اس آیت کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

والظن ھنا بمعنی الیقین۔
کہ یہاں ظن کا معنی یقین ہے۔

۲۔ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ (التکویر: ۲۴) اس میں دوسری قرأت ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِظَنِيْنٍ۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ کا رسول غیب پر متہم نہیں۔ ابو عبداللہ القرطبی اس کے ضمن میں لکھتے ہیں:

بالظاء قرأة ابن کثیر وابی عمرو والکسائی ای بمتهم
والظنة التهمة۔ قال الشاعر

اما وکتاب الله لا عن شناءة   هجرت ولکن الظنين ظنين[1]

یعنی ابن کثیر، ابی عمرو اور کسائی نے اسے ظنین پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے متہم اور الظنة تہمت کو کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:۔

اللہ کی کتاب کی قسم! مجھے اس لئے چھوڑا نہیں گیا کہ مجھے اس سے واقعی عداوت تھی بلکہ مجھے متہم کیا گیا ہے۔ کہ میں اس کا دشمن ہوں۔

٣۔ مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيْظُ۔ (الحج: ١٥)

ترجمہ:۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا۔ وہ چھت سے کوئی چیز لٹکا کر (گلے میں ڈال لے) اور پھر اسے کاٹ دے (یعنی اپنے آپ کو پھانسی دے کر ہلاک کرلے) پھر دیکھئے کہ اس حیلہ سے کیا اس کا غصہ فرو ہوا؟

اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں ان کفار اور منافقین کو جو اس بات میں شک کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مدد کرے گا یا نہیں۔ انہیں خطاب فرماتے ہیں، یہاں ’ظن‘ کا معنی خیال اور شک کرنا ہے۔

٤۔ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا

[1] تفسیر القرطبی ج ١٩ ص ٢٤۔

اٰبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (الانعام: ١٤٨)

ترجمہ:۔ اب مشرک کہیں گے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا کئے ان سے اگلے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا (میرے رسول!) ان سے کہو اگر تمہارے پاس اس بات کا علمی ثبوت ہو تو ہمیں دکھاؤ۔ تم تو نری اٹکل (ظن) پر چلتے ہو۔ اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو۔

یہاں ظن کا معنی وہ بے سروپا بات ہے جسے انسان صرف اپنے وہم وگمان سے فرض کرلے اور جس کی صحت پر کوئی دلیل نہ ہو۔ اور یخرصون کا لفظ اس معنی کی اور تائید کرتا ہے۔ کیونکہ خرص کہتے ہیں صرف اندازے اور تخمینہ سے کسی امر کے متعلق کچھ فیصلہ کرنا۔

امام اللغۃ والتفسیر جاراللہ زمخشری نے اس کا معنی کیا ہے:

الظن الوهم والخيال۔

یعنی یہاں ظن کا معنی وہم اور خیال ہے۔

اس تفصیل سے مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ظن کے کئی معانی ہیں اور کلام کے سیاق وسباق کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی مخصوص مقام پر ظن کا کونسا معنی مراد ہے۔

خبر واحد پر اعتراض اور اس کا جواب

اب اس اعتراض کی طرف توجہ فرمایئے جو خبر واحد کے متعلق منکرینِ سنت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تم مانتے ہو کہ 'خبر واحد' ظن کا فائدہ دیتی ہے اور اس کے باوجود کہتے ہو کہ 'خبر واحد' کی اطاعت لازمی ہے۔ یعنی ظن کی اطاعت لازمی ہے۔ حالانکہ ظن کی اطاعت کی قرآن نے مذمت کی ہے۔ اور دلیل کے طور پر یہ آیت جو ابھی آپ پڑھ چکے ہیں اور چند اور آیات کا ذکر کرتے ہیں۔

ہم ان کی خدمت میں بصد ادب عرض کریں گے کہ ہم مانتے ہیں کہ قرآن کریم میں اتباعِ ظن کی مذمت کی گئی ہے لیکن ظن تو کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کیا یہ تمام معانی مذموم ہیں؟ اس سے تو انہیں بھی اتفاق نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر ظن بمعنی یقین کے ہو تو وہ مذموم نہیں۔ اس لئے ہمیں ان آیاتِ کریمہ پر غور کرنا چاہئے جہاں اتباعِ ظن سے روکا گیا ہے کہ اس جگہ ظن کا کیا معنی ہے۔ اس آیت میں بھی ظن سے مُراد وہم وخیال ہے جس کے لئے کوئی سند نہ ہو کوئی دلیل نہ ہو۔ اور اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ اس معنی کو اور واضح کر دیتا ہے۔ اور قرآنِ کریم کا یہ معجزہ ہے کہ اس میں غور کرنے سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے۔ جہاں بھی کفار کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ظن کا اتباع کرتے ہیں۔ وہاں دوسرے جملہ میں اس ظن کا معنی بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔

یہاں فرمایا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ تو اس کے بعد فرمایا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ کہ تم تو صرف تخمینے لگاتے ہو۔ یعنی عقل اور دلیل سے کوئی بات نہیں کہتے۔

سورۂ یونس کی آیت ۶۶ میں کفار کے متعلق فرمایا تو ساتھ ہی بتا دیا اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔

سورۂ نجم کی آیت ۲۳ میں کفار کے بتوں کا ذکر کرنے کے بعد جب یہ فرمایا کہ کفار اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ کہ وہ اپنے ظن کا اتباع کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کی تفسیر کر دی وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ، یعنی یہ تو اس کی پیروی کرتے ہیں جو چیز اُن کے نفسوں کو پسند ہو۔ یعنی ہوائے نفس کے پیروکار ہیں کسی دلیل کے پابند نہیں۔

اور اس آیت کے اختتامی جملہ نے ان کے 'ظن' کے باطل اور بے بنیاد ہونے پر تو مُہر ثبت کر دی ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝

یعنی "ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت کا نور پہنچ گیا ہے"۔ جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ان کے یہ اوہام اور ظنون باطل ہیں اور وہ پھر بھی اپنے فاسد عقائد میں حق کی نہیں بلکہ اپنے اَہوائِ نفسانی کی اطاعت کر رہے ہیں۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ ایسے ظن کی اطاعت باطل ہے جس کی بنیاد خواہشِ نفسانی ہو، کفر ہے اگر وہ ظن کسی آیتِ قرآنی یا کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو۔

اور علماءِ حدیث نے خبر واحد کے مقبول ہونے کی شرائط میں یہ صاف ذکر کیا ہے کہ ایسی خبر مردود ہوگی جو قرآنِ کریم اور سنتِ متواترہ کی کسی نص قطعی کے خلاف ہو۔

تو ان حضرات کا ظن کے لفظ سے خبر واحد پر اعتراض کرنا بالکل بے بنیاد

ہے اور ناقابلِ التفات ۔ قرآن کریم میں جہاں بھی ظن کے اتباع سے روکا گیا ہے وہاں وہ ظن ہے جو وہم و گمان کا ہم معنی ہے اور جو کسی آیتِ کریمہ کے متضاد ہے۔

خبرِ واحد پر عمل کرنے کے عقلی دلائل

لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ اس بات پر مُصر ہوں کہ نہیں ہر ظن کی پیروی سے قرآن نے روکا ہے اور جب تک کسی بات کا قطعی ثبوت نہ مل جائے اس پر عمل کرنا ناجائز اور مذموم ہے۔

تو عرض ہے کہ اگر جج کے سامنے گواہوں نے شہادت دی کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کو قتل کیا ہے اور رد و قدح کے بعد گواہوں کی شہادت صحیح تسلیم کر لی گئی تو کیا قانون جج کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ قاتل کو پھانسی یا عمر قید کی سزا دے حالانکہ یہ شہادت ظنی ہے، کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ یہ گواہ ممکن ہے جھوٹے ہوں یا ان کو قاتل کی شناخت میں دھوکہ ہوا ہو۔ لیکن اس کے باوجود جج پر فرض ہے کہ اس شہادت پر اعتماد کرتے ہوئے سزا دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا۔

اس طرح ہمیں بھی جب حدیث کے متعلق جرح و قدح کرنے کے بعد اس کی صحت کے متعلق علم حاصل ہو جائے تو ہم پر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے ماتحت کہ اطیعوا الرسول یہ فرض ہو جائے گا کہ ہم اس حدیث پر عمل کریں۔ اور اگر ہم عمل نہیں کریں گے تو نافرمان ہوں گے۔

دوسری دلیل

ہمیں حکم ہے کہ نماز ادا کرتے وقت خانہ کعبہ کی طرف منہ کریں۔ اب ہم

ہزاروں میل دُور سے خانہ کعبہ کی طرف رُخ بالکل کعبے کی سمت میں ہے یا نہیں۔ لیکن اپنی کوشش سے جو سمت ہم مقرر کرلیں اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے تعمیلِ حکمِ باری ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب تک مجھے یقینی طور پر نہ معلوم ہو جائے کہ کعبہ کہاں ہے تو میں نماز نہیں پڑھوں گا، کیونکہ نماز کی صحت کے لئے قبلہ رو کھڑا ہونا شرط ہے اور مجھے قبلہ کا یقینی علم نہیں۔ کیا آپ اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ اس حیلہ سے ادائے نماز سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح کوشش و تفحص سے جن احادیث کی صحت کا علم ہمیں حاصل ہو گیا۔ ہم ان پر عمل کرنے کے پابند ہیں اور اگر نہیں کریں گے تو ہم بھی اس شخص کی طرح ہوں گے جس کی ساری جد و جہد احکام الٰہی سے بچ نکلنے کے لئے حیلے تراشنے میں صرف ہوتی رہتی ہے۔

تیسری دلیل

اس کو بھی جانے دیجئے۔ ہم منکرینِ سنت کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ "یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے"۔ سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے۔ اور حکم بھی فقط اُسی کا حکم ہے۔

اب اگر آپ احادیثِ نبوی ؐ کو ترک کر دیں اور قرآنِ کریم کی آیات کے معانی خود (یا مرکزی حکومت یا ماہرین کا کوئی بورڈ) اپنے اجتہاد سے متعین کریں تو وہ مسائل جو آپ نے اپنے اجتہاد سے مستنبط کئے ہیں کیا آپ یقینی طور پر ان کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات سے منشاء الٰہی بعینہٖ یہی ہے۔ یقیناً نہیں کیونکہ المجتهد قد يخطی وقد يصيب مجتہد انسان ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے (یا مرکزی حکومت

یا متعینہ بورڈ نے) انتہائی کوشش اور دیانتداری سے ان کو اصولِ قرآنی سے اخذ
کیا ہے اور ان میں اگرچہ صحت کا پہلو وزنی ہے لیکن غلطی اور خطا کا احتمال موجود
ہے۔ کیونکہ یہ مجتہد (فرد ہو یا جماعت) غیر معصوم ہے۔ اور علماء حدیث کے نزدیک
اسی کو ظن کہتے ہیں۔ اب اگر حکومت آپ کے (یا جماعت کے) ان اجتہادی مسائل
کو نافذ کرنا چاہے اور کوئی حکومت کے ان احکام کو یہ کہہ کر ٹھکرا دے کہ حکم صرف
اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہ تمہارے اجتہادی مسائل کے متعلق ہمیں یقین نہیں کہ یہی
احکام الٰہیہ ہیں۔ اس لئے ہم ان ظنی احکام کو نہیں مانتے کیونکہ قرآن نے ہمیں
اتباعِ ظن سے منع کیا ہے اور وہ ساری آیتیں بے سمجھے دہرا دے جن کو آپ سنت
نبویؐ کو متروک العمل ثابت کرنے کے لئے زور شور سے پڑھتے ہیں۔ تو کیا اس شخص کی
اس قرآن فہمی کو آپ تسلیم کرتے ہوئے امت کو انارکی اور لاقانونیت کے سپرد کر دیں گے۔

اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو یہ کیا انصاف ہے کہ ایک ظن کو جسے آپ کے
اجتہاد کی سند حاصل ہے تو واجب العمل قرار دیتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی
کرنے والے کو دہشت پسند اور فتنہ ساز کہتے ہیں اور اگر سنتِ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وآلہ وسلم کی صحت کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ قوی علم حاصل ہوتا ہے جتنا
خود آپ کو اپنے اجتہاد کی صحت پر ہے تو ان احادیثِ طیبہ پر عمل کرنے سے روکتے
ہیں اور جو شخص الحاد و مادیت کی ظلمتوں میں نورِ محمدی کی تجلیات میں جادۂ زیست
پر گامزن ہے۔ اس کی راہ میں تشکیک و شبہات کے کانٹے بچھاتے ہیں اور اس کی
پشت میں طعن و تشنیع کے پیکان پیوست کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

ظن کتنے معانی میں مستعمل ہوتا ہے جس ظن کی اتباع سے قرآنِ کریم نے منع فرمایا
ہے۔ اس کا کیا معنی ہے۔ علماء حدیث جو یہ کہتے ہیں کہ خبرِ واحد ظن کا فائدہ دیتی ہے۔
اس ظن کا اصطلاحی مفہوم کیا ہے۔ اگر ظن اس معنی میں حاصل ہو تو کیا ہم اس کے

مطابق عمل کرنے پر پابند ہیں یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان مسائل پر سیر حاصل تبصرہ ہو
چکا ہے مزید اطمینان کے لئے اب یہ عرض کرتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا
عمل مبارک کیا تھا اور کیا خلفاء راشدین خبرِ واحد پر عمل کیا کرتے تھے یا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل

حضورؐ نے قبائلِ عرب اور فرمانروایانِ ممالک کی طرف تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ
احکام کے لئے صحابہ کو بھیجا۔ ان کی تعداد عام طور پر ایک یا دو ہوا کرتی تھی۔ جیسے
یمن میں حضرت معاذ، مکہ مکرمہ میں عتاب بن اسید کو تبلیغِ احکام کے لئے بھیجا۔ اپنے
گرامی نامے دے کر دحیہ کلبی کو قیصرِ روم کی طرف، حذافۃ السہمی کو کسریٰ کی طرف،
عمرو بن امیہ الضمری کو نجاشی کی طرف، عثمان بن العاص کو امراء طائف کی طرف،
حاطب بن بلتع کو مقوقس صاحب اسکندریہ کی طرف اور شجاع بن وہب اسدی کو
حارث بن ابی شمس والیٔ دمشق کی طرف روانہ فرمایا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک اور دو دو صحابہ کے بھیجنے کا اس کے بغیر اور کیا مقصد
تھا کہ یہ لوگ جا کر اشاعتِ دین کریں اور لوگ ان کے اقوال کو تسلیم کر کے ان
پر عمل پیرا ہوں، تو اس سے پتہ چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی ایک دو شخصوں
کی بیان کردہ روایت واجب العمل ہے اور یہی خبرِ واحد ہے۔

نیز حضورؐ کی خدمت میں اگر کوئی معتبر آدمی کوئی خبر عرض کرتا تو اسے قبول فرماتے۔
ایک دفعہ حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ یہ مال ہدیہ ہے اور یہ صدقہ۔ صدقہ حضورؐ
پر حرام تھا اور یہ ہدیہ حلال، تو حضورؐ نے سلمان فارسیؓ کی اس خبر کو صحیح مانا اور اسی پر
عمل فرمایا۔ اسی طرح ایک بار امِ سلمیٰ رضی اللہ عنہا نے ہدیہ و صدقہ کے متعلق خبر دی
تو حضورؐ نے قبول فرمائی جو چیز خدا کے محبوب اور سید الانبیاء کے معیار کے مطابق واجب
العمل ہے۔ وہ کیا اس کی امت کے لئے واجب نہ ہوگی؟ انصاف شرط ہے۔

خبر واحد پر خلفائے راشدین کا عمل

اسی طرح اگر خلفائے راشدین کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا۔ تو وہ فیصلہ کرنے سے پہلے قرآنِ کریم میں غور کرتے۔ اگر اس کا حکم وہاں مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر قرآنِ کریم میں اس کا کوئی حکم نہ ملتا تو پھر احادیثِ نبوی کی طرف رجوع کرتے۔ اور اگر کوئی ایسی حدیث بھی نہ ملتی تب اپنے اجتہاد سے اس کا فیصلہ فرماتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حدیث کی موجودگی میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دیا ہو اور حدیث کو چھوڑ دیا ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ پہلے تلاش و تجسس سے کسی حدیث کا پتہ نہیں چلا اور عین فیصلہ کرتے وقت کسی صحابی نے آکر یہ خبر دی کہ اس بارے میں رسول اللہ کا یہ فرمان ہے۔ وہ اپنے قیاس کو نظر انداز کر دیتے اور اس ایک صحابی کی روایت کردہ حدیث پر عمل پیرا ہوتے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ جملہ تو کئی دفعہ آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔

لو لم نسمع هذا لقضينا فيه بخلاف ذلك[1]۔

یعنی اس معاملہ میں اگر ہمیں یہ حدیث نہ پہنچتی تو ہم نے اس کے خلاف فیصلہ دیا ہوتا۔
خبر واحد کے مقابلہ میں خلفائے راشدین نے کبھی اپنے قیاس و اجتہاد کو ترجیح نہیں دی، بلکہ ہمیشہ خبر واحد پر عمل کیا۔ کتب حدیث و تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے چند ایک ذکر کر دیتا ہوں۔

۱۔ خلافت صدیقی کے زمانہ میں حضرت صدیقِ اکبرؓ کے سامنے دادی نے اپنے پوتے کے ترکہ سے اپنا حق وراثت طلب کے لئے مقدمہ دائر کیا۔ آپ نے قرآنِ کریم میں غور کیا، اس کا حصّہ نہ ملا۔ آپ کو اس کے متعلق کوئی فرمانِ نبوت بھی یاد نہیں تھا۔

[1] المستصفی للامام الغزالی ج ۱ ص ۹۔

اس لئے اپنے اجتہاد کے مطابق دادی کو وراثت سے محروم کرنے لگے۔ اتنے میں مغیرہ بن شعبہؓ آن پہنچے اور ایک حدیث سنائی جس میں حضورؐ نے دادی کو ورثہ دیا تھا۔ اور محمد بن مسلمہؓ نے گواہی دی کہ ہاں میں نے بھی حضورؐ سے ایسا ہی سُنا ہے تو حضرت صدیقؓ نے اپنے اجتہاد کو ترک کر دیا۔ اور اس خبر واحد پر عمل کرتے ہوئے اسے وراثت سے حصّہ دلایا۔ (الاحکام الآمدی ج ۱ ص ۱۷۴)

۲۔ مجوس کے متعلق حضرت عمرؓ بہت تذبذب میں تھے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اور اہل کتاب کی طرح ان سے جزیہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ تو صرف حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بیان کرنے پر کہ حضورؐ نے مجوس سے جزیہ لیا آپ نے مجوس سے جزیہ لینا شروع کیا۔

قال عمر ما ادری ما اصنع بالمجوس ولیسوا اهل الكتب؟
فقال عبد الرحمن بن عوف رحمة الله سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول "سنوا بهم سنة اهل الكتب"۔ (المستصفى للغزالی ج ۱ ص ۹۵)

ترجمہ، حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ مجوس کے ساتھ کیا برتاؤ کروں اور یہ اہل کتاب بھی نہیں تاکہ یہود و نصاریٰ کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انہیں بتایا کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے سُنا کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔

ابو داؤد میں ہے۔

لم یکن عمر یاخذ الجزیة من المجوس حتی شهد عبد الرحمن بن عوف "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اخذها من مجوس هجر"۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ مجوس سے جزیہ نہیں لیا کرتے تھے، یہاں تک عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے شہادت دی کہ حضورؐ نے مجوس ہجر سے جزیہ قبول فرمایا۔

یہ خبر واحد ہے جس پر حضرت عمرؓ نے عمل کیا۔ یہ نہیں کہا کہ یہ حدیث ظاہر و اعم ہے اس لئے میں اس پر عمل کرنے کا پابند نہیں۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے طاعون سے مجتنب رہنے کی حدیث پر عمل کیا اور اس کے راوی بھی صرف عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے۔

۴۔ ایک دفعہ ایک عورت نے عدالتِ فاروقی میں مقدمہ دائر کیا کہ میرا خاوند قتل ہوگیا ہے قصاص کی بجائے اس کا خونبہا ادا کیا گیا ہے۔ اس خونبہا سے مجھے بھی حقِ وراثت ملنا چاہئے۔ یہ ایک انوکھی جزئی تھی۔ جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم تھا اور نہ آپ کو اس کے متعلق کوئی حدیث معلوم تھی۔ اس لئے اپنے قیاس سے اس کا یہ فیصلہ کیا کہ تجھے دیت میں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ ورثہ مالِ متروکہ سے نہیں تاکہ اس میں سے تجھے حصہ ملے، لیکن اس وقت ضحاک بن سفیان نے حدیث سنائی کہ حضورؐ نے عورت کو اس کے مقتول خاوند کی دیت سے حصہ دیا تو اس پیکرِ سطوت وتمکنت نے جس کے نام سے قیصر وکسریٰ کے دل دہل جاتے تھے اپنا فیصلہ واپس لیا اور اپنے آقا ومولا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سرِ مو انحراف نہ کیا۔ اگرچہ اس حدیث کے راوی صرف ضحاک بن سفیان تھے اور خبر واحد تھی[1]۔

۵۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ جنین (وہ بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو) کی دیت کا فیصلہ کرنے لگے۔ قیاس کا تو یہ تقاضا تھا کہ اگر جنین زندہ ہے تو پوری دیت ادا کی جائے اور اگر مرا ہوا ہے تو کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن آپ نے فقط حمل بن مالک کی روایت کردہ حدیث کے موافق فیصلہ دیا کہ جنین کی دیت غرہ[2] ہے۔ اور فرمایا کدنا ان نقضی فیہ برأینا وفیہ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی قریب تھا کہ ہم

---

[1] المستصفی للغزالی ج ۱ ص ۹۵۔

[2] غرہ وھی نصف عشر الدیۃ قدرھا خمسمائۃ درھم۔ دیت کا بیسواں حصہ۔ (فتاوٰے خیریہ۔ جلد دوم)۔

اس کا فیصلہ اپنی رائے سے کر دیتے حالانکہ اس بارے میں سرورِ عالم کی حدیث موجود تھی۔ یعنی اگر ہم ایسا کرتے تو سخت غلطی کرتے۔

وہ حضرات نہایت وثوق سے فرماتے ہیں کہ خلفائے راشدین حضورؐ کی احادیث کے خلاف مقدمات اور ملکی مسائل کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ امید ہے کہ یہ چند مثالیں سرمہ چشمِ بصیرت کا کام دیں گی۔ ہاں خلفائے راشدین نے ان روایتوں کو بے شک ترک کر دیا جن کی صحت میں انہیں شبہ ہوا جیسے فاطمہ بنت قیس کی روایت جس کو انہوں نے بھی ترکِ سنت کے لئے بطورِ دلیل پیش کیا ہے اس کو ناقابلِ عمل قرار دینے کی وجہ خود حضرت عمرؓ کے اپنے الفاظ میں سنئے:

لا نترک کتاب ربنا وسنۃ نبینا بقول امرأۃ لا نعلم ذکرت ام نسیت۔

کہ کتابِ الٰہی اور سنتِ نبویؐ کے صریح احکام کو کسی عورت کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے جس کے متعلق ہمیں یہ تسلی نہیں کہ کیا اسے صحیح بات یاد بھی رہی یا بھول گئی۔

تو اس روایت کو حضرت عمرؓ نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ یہ حدیث ہے اور حدیث ان کے نزدیک واجب العمل نہ تھی جیسا ان کا خیال ہے بلکہ اس لئے ترک کیا کہ یہ روایت آیتِ قرآنی اور سنتِ مشہور کے خلاف تھی۔ اور یہ ہم پہلے تصریح کر چکے ہیں کہ ہر ایسی خبر واحد جو کتاب اللہ یا سنتِ مشہورہ کے خلاف ہو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

اس مشتبہ حدیث کے ترک کر دینے سے احادیث صحیحہ کے متروک یا عدمِ حجت ہونے پر استدلال کرنا انتہائی درجہ کی بیباکی ہے۔

قیاس اور خبر واحد

اصولِ فقہ کا ایک اور مسئلہ ہے جس کی طرف مختصر سا اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔

امید ہے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ اگر خبر واحد قیاس کے خلاف ہو تو ترجیح کس کو دی جائے گی۔ قیاس کو یا خبر واحد کو؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ صحابی جس نے یہ حدیث حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کی اگر فقہاء صحابہ سے ہے مثلاً خلفاء راشدین، حضرت صدیقہ، عبادلہ ثلاثہ، معاذ بن جبل وغیرہ رضی اللہ عنہم تو حدیث کو ترجیح دیں گے اور قیاس کو ترک کر دیں گے، لیکن اگر اس صحابی کا شمار فقہاء صحابہ سے نہیں لیکن اس کی عدالت اور قوتِ حفظ وضبط مسلمہ ہے تو پھر اگر وہ ایک قیاس کے مطابق ہوئی اور دوسرے کے مخالف تو پھر بھی قیاس مخالف متروک ہوگا۔ لیکن اگر خبر واحد تمام قیاساتِ ممکنہ کے خلاف ہے تو خبر واحد کو ترک کر دیں گے اور قیاس پر عمل کریں گے[1]

اس کا دوسرا حل جو علامہ آمدی نے ابوالحسین بصری سے نقل کیا ہے وہ بہت ہی جامع اور مفصل ہے۔ امید ہے آپ بھی اسے پسند کریں گے۔ لیکن اسے ذکر کرنے سے پہلے مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں "قیاس" کا مفہوم بھی عرض کر دوں۔ کیونکہ خبر واحد کی تعریف آپ پڑھ چکے ہیں اور قیاس کے مفہوم کو سمجھ لینے سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا۔

علماء اصول کے نزدیک قیاس کا مفہوم یہ ہے۔

استخراج مثل الحکم المذکور لما لم یذکر بجامع بینھما۔[2]

یعنی ایک چیز کے لئے ایک حکم مذکور ہے (مثلاً یہ کہ شراب حرام ہے) اور ایک دوسری چیز کے لئے (مثلاً افیون کے لئے) کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن جس علت (نشہ آور) کی وجہ سے پہلی چیز (شراب) پر (حرمت کا حکم دیا گیا ہے وہ علت (نشہ آور) بعینہٖ اس دوسری چیز (افیون) میں بھی

[1] التقریر شرح التحریر ج ۲ ص ۲۹۹۔ [2] ارشاد الفحول للشوکانی ص ۱۹۸۔

پائی جاتی ہے تو اس علت کے مشترک ہونے کی وجہ سے مذکورہ حکم (حرمت) اس دوسری چیز (افیون) کے متعلق ثابت کیا جاتا ہے اس کو اصطلاح فقہاء میں قیاس کہا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیاس کے چار عنصر ہیں۔ پہلا وہ حکم جو مذکور ہے۔ (مثلاً حرمتِ شراب) دوسرا اس کی علت (نشہ آور ہونا) تیسرا وہ چیز جس کے متعلق کوئی حکم مذکور نہیں (مثلاً افیون) چوتھا اس میں پہلے کی علت پایا جانا۔ (مثلاً افیون کا نشہ آور ہونا)۔

قیاس کی حقیقت اور اس کے عناصر ہم نے سمجھ لئے اور خبر واحد کے متعلق قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔ اب ابوالحسین بصری کے اس حل کی طرف توجہ فرمائیے:

کہتے ہیں کہ اگر خبر واحد اور قیاس میں اس طرح کا تعارض ہے کہ ان میں کسی طریقہ سے تطبیق نہیں کی جاسکتی تو پھر دیکھیں گے کہ وہ علت جس کی وجہ سے اصل میں حکم ثابت ہوا وہ علتِ نص سے ثابت ہے یا ہم نے اپنے اجتہاد سے اس علت کو مستنبط کیا ہے۔ اگر وہ نص سے ثابت ہے تو پھر دیکھیں گے کہ یہ نص علت پر قطعاً دلالت کرتی ہے یا نہیں۔ اگر قطعاً دلالت کرتی ہے تو اس وقت خبر واحد کو ترک کر دیا جائے گا اور قیاس پر عمل کریں گے۔ اور اگر وہ نص علت پر قطعی طور پر دلالت نہیں کرتی تو پھر خبر واحد پر عمل کریں گے اور قیاس کو چھوڑ دیں گے۔

اور اگر حکم کی علت نص سے ثابت نہیں تو پھر دیکھیں گے کہ وہ کس دلیل سے ثابت ہے۔ کیا خبر واحد سے ثابت ہے یا کسی دلیل قطعی سے۔ اگر خبر واحد سے ثابت ہے تو قیاس پر عمل نہیں کریں گے بلکہ خبر واحد پر۔ اور اگر کسی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر مجتہد کو اجازت ہے کہ وہ مصلحت کو دیکھ کر فیصلہ کرے[1]

[1] الاحکام فی اصول الاحکام للامام ابی الحسن الآمدی ج ۱ ص ۲۰۱

اگر آپ احکامِ شرعی اور عقلِ سلیم کی محیر العقول ہم آہنگی ملاحظہ کرنے کے شائق ہوں تو علامہ ابن تیمیہ کی کتاب 'القیاس فی الشرع الاسلامی' کا مطالعہ کریں۔

فاضل مصنف نے تمام ان مسائل شرعیہ کو جنہیں بظاہر خلافِ قیاس سمجھا جاتا ہے۔ ثابت کیا ہے کہ وہ مسائل قیاس صحیح کے عین مطابق ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ہمارا یہ دعوٰی کہ احکامِ شرعی قیاس کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ احکامِ شرعی ہر بُوالہوس کے فکرِ بے زمام کی اقتدا کرتے ہیں تاکہ ہر کہ و مہ جب کسی حکم کو اپنی مصلحت ہوس رانی وعیش کوشی کے خلاف پائے تو اسے مخالف قیاس ٹھیرا کر آزادی سے دادِ طغیان وعصیان دیتا پھرے۔ بلکہ احکام شرعی کی مطابقت صرف قیاس صحیح اور فکر صالح سے ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہم اپنے قیاس کی صحت وسقم کو احکامِ شرعی کی کسوٹی پر پرکھتے لیکن نیرنگیٔ روزگار کی کرشمہ زائیاں ملاحظہ ہوں۔ اب مسلمان احکامِ دین کی صحت کے لئے قاضیٔ عقل کے فتوٰی کا منتظر رہتا ہے۔

بحثِ نسخ

ہم عربی کے الفاظ اکثر اُردو زبان میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات ہم ان کے اصلی معنی سے زائد کوئی مفہوم ان سے اخذ کرنے لگتے ہیں اور پھر اسی مفہوم کو اسی لفظ کا موضوع لہ یعنی اصلی معنی تصوّر کرتے ہیں۔

ایک روز ترکی ریڈیو سٹیشن سے اُردو میں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ اور خبر سُنانے والے حضرت کوئی ترک ہی تھے۔ اچانک ان کی زبان سے جب یہ فقرہ نکلا کہ فلاں چھاؤنی میں فوزی چقمقاق (اس وقت کے سپہ سالار افواجِ ترکیہ)

فلاں پلاٹون کی زیارت کر گئے" تو مجھے لفظ زیارت کا استعمال بڑا انوکھا اور عجیب سا معلوم ہوا۔ حالانکہ اس میں انوکھا پن نام کو بھی نہیں تھا۔ یہ عربی لفظ ہے عربی میں زَارَ یَزُوْرُ زِیَارَۃً کا معنی ہے "اتاہ بقصد الالتقاء بہ" کسی کی ملاقات کے لئے جانا۔

انہوں نے بالکل صحیح استعمال کیا تھا۔ لیکن میرے تعجب کی وجہ یہ تھی کہ اُردو میں زیارت کے معنی میں قصدِ ملاقات، کے ساتھ ایک اور مفہوم بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ جس کی ملاقات کا قصد کیا گیا ہو وہ تقدس اور بزرگی کا حامل بھی ہو۔ یہ ہم کہتے ہیں کہ میں نے فلاں عالم دین یا فلاں مردِ خدا کی زیارت کی۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہے گا کہ وزیر تعلیم طلباء مدارس کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

یہ مثال عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بسا اوقات ہم عربی الفاظ کے ساتھ اپنے خاص مفہومات اس طرح چسپاں کر دیتے ہیں کہ ان کے اصلی معنی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال اگر ان الفاظ سے ہو جو علوم اسلامی میں ایک خاص معنی میں بولے جاتے ہیں تو اس سے عجیب عجیب قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یار لوگوں کے لئے یہ غلط فہمیاں دین کی تضحیک واستہزاء کا سامان بن جاتی ہیں۔

انہیں الفاظ میں سے لفظ 'نسخ' ہے۔ علمِ اصول میں اس کا ایک خاص معنی ہے جس کی وضاحت بعونہ تعالیٰ وتوفیقہ ابھی کروں گا۔ لیکن عام طور پر لفظ نسخ سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ حاکم نے کوئی حکم دیا۔ اب اس حکم کے خراب نتائج سامنے آئے تو اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ جب وقت لفظ نسخ ہم استعمال کرتے ہیں تو معاً دو چیزوں کا ہمیں خیال آجاتا ہے ایک تو یہ کہ پہلا حکم غلط تھا۔ دوسرا یہ کہ حاکم کو جہالت کے باعث اس کی غلطی اور سقم پر آگاہی نہ تھی۔ اب

اس معنی کو ذہن میں لئے ہوئے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی فلاں آیت منسوخ ہے یا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی فلاں حدیث منسوخ ہے۔ تو ہم فوراً اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے پہلے غلط حکم کیوں دیا۔ کیا انہیں اس کی غلطی اور سقم کا علم نہ تھا یا دانستہ (نعوذ باللہ) مذاق کیا؟ جب نسخ کا یہ تصوّر ہمارے ذہن میں ہو، تو ایسی کشمکش کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی اَمر ہے۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ناسخ ومنسوخ سے بحث کرنے سے قبل نسخ کا مفہوم حتی الوسع واضح کردوں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ شارع جس فعل کے کرنے کا حکم دیتا ہے وہ فعل حسن وخوبی کا حامل اور ہر لحاظ سے مفید ہوتا ہے اور جس فعل سے روکتا ہے۔ وہ قبیح اور مضر ہوتا ہے۔ یہ اس کی حکمتِ کاملہ کے خلاف ہے کہ مضر کام کرنے کا حکم دے اور مفید کام کرنے سے منع فرمادے۔ ضرورتِ حال کے مطابق احکام میں تغیر اور تبدّل ہوتا رہا ہے اور جس وقت کے لئے جو حکم نافذ کیا گیا ہے وہی خیر وبرکت کا حامل تھا۔

آپ نے دیکھا نہیں قابل اُستاد اناڑی بچّے کو کس طرح حصولِ علم کی طرف راغب کرتا ہے۔ وہ اس کی لااُبالی طبیعت کو یک لخت پابندی کی زنجیر میں جکڑ نہیں دیتا، بلکہ دھیرے دھیرے اسے ضبط ونظم کا خوگر کرتا ہے اور جب وہ بچّہ لذّتِ علم سے آشنا ہونے لگتا ہے تو اُستاد کے احکام میں بھی تبدیلی ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بچّہ اُستاد کی حسنِ تربیت سے اس سطح پر آجاتا ہے کہ اس کی آوارگی ختم ہوجاتی ہے۔ دن اور رات اسے پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ میٹھی نیند کے مزے بھی اس کی بے خواب آنکھوں کو سلا نہیں سکتے۔ اور سیر وتفریح کی نشاط آور یاد بھی اسے اپنے مطالعہ کی میز سے ہٹا نہیں سکتی۔ اس کی ساری خوشیاں

اور لذتیں سمٹ کر اس گوشۂ تنہائی میں جمع ہوجاتی ہیں جہاں بیٹھ کر وہ پڑھا کرتا ہے۔

لیکن اگر اُستاد اُسے یک لخت ہی مقیّد کر دیتا اور ایک بار ہی اس پر بوجھ ڈال دیتا تو کیا وہ اس بچّے کو علم سے ہمیشہ کے لئے متنفر نہ کردیتا؟ اس اثنا میں اس کے اسلوبِ تربیت میں جو تفاوت اور فرق آپ کو نظر آتا ہے کیا یہ درست نہیں؟ یقیناً درست ہے اور استاد کی اعلیٰ قابلیت کی دلیل ہے۔

اسی طرح جس اُمّت کو سیدھے راستہ پر لگانے کا کام پیغمبر اسلام کے سپرد ہوا اس میں اکھڑپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ صدیوں سے ہر سیاسی، اخلاقی اور قانونی قید وبند سے آزاد چلے آرہے تھے۔ ان کے مزاج کی آوارگی اور ان کے ارادوں کی بے راہ روی نے اگرچہ انہیں کسی کام کا نہ چھوڑا تھا، لیکن وہ اس پر صرف خوش ہی نہ تھے بلکہ نازاں تھے۔ اب ایسی قوم کو ایک جامع اور مکمل نظام حیات کا پابند کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ علیم وحکیم رب نے اپنے رؤف ورحیم بندے صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کس طرح ان کی طبیعتوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا کس طرح ان کو ضبط ونظم کا عادی بنایا۔ قرآن کے اوراق اور احادیث کے صفحات میں اس کا تفصیلاً ذکر موجود ہے۔ اس ضابطۂ حیات کا اجراء دفعتاً نہیں کر دیا گیا بلکہ بائیس تیئیس سال کے عرصۂ دراز میں ایک ایک کرکے اس کے احکام نافذ کئے گئے۔ بعض امور میں پہلے ڈھیل دی گئی بعد میں جب وہ عادی ہونے لگے تو سختی کردی۔ بعض چیزوں میں پہلے سختی سے کام لیا گیا اور جب اس کا مقصد پورا ہوگیا تو اس میں نرمی کردی گئی۔ مناسب حال احکام نافذ فرما کر اپنی حکمتِ بالغہ سے اس شریعتِ مطہرہ کی بنیادوں کو اس طرح استوار کردیا کہ قیامت تک اس میں ضعف پیدا نہ ہو۔

اس تفصیل کے بعد آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہؐ کا کسی حکم کو منسوخ کرنا اور دوسرا نافذ کرنا، اس لئے نہیں کہ پہلا حکم غلط تھا یا اس کی غلطی کا علم نہ تھا، بلکہ اس لئے کہ اس وقت وہی حکم درست اور مفید تھا اب اس کے افادہ کی میعاد ختم ہوگئی ہے اس لئے علیم وخبیر خدا نے دوسرا حکم نافذ فرما دیا۔ اور اب ضرورتِ وقت کے مطابق وہی مفید ہے۔ یہی نسخ ہے۔ غور فرمائیے کیا اس میں کوئی عقلی استحالہ ہے؟

نسخ کی مختصر تعریف تو یہ ہے:

وھو رفع الشارع حکماً شرعیاً بدلیل شرعی۔

یعنی شارع کا ایک حکم شرعی کو دوسری دلیل شرعی سے ساقط کر دینا۔

اس کی دو جہتیں ہیں ایک بالنسبة الینا یعنی نسخ سے ہم تو یہی سمجھیں گے کہ پہلا حکم ساقط ہوگیا اور وہ اس کی جگہ اب دوسرا حکم نافذ ہوگیا اور دوسری جہت بالنسبة الی الشارع یعنی شارع کے علم کے مطابق کسی نافذ حکم کو ساقط نہیں کیا گیا بلکہ صرف پہلے حکم کی تعمیل کی مدت بتا دی گئی کہ یہ حکم اس وقت تک واجب العمل تھا۔ اب اس کی میعاد ختم ہوگئی۔ اس کی جگہ آج یہ حکم جاری کیا جاتا ہے۔

کتاب التحقیق میں ہے۔

وفی حق صاحب الشرع بیان محض لانتهاء الحکم الاول لیس فیه معنی الرفع۔

نسخ صاحبِ شریعت کی نگاہ میں پہلے حکم کے میعاد کے ختم ہونے کا بیان ہے اس سے کسی جاری کردہ حکم کو ساقط کرنا مقصود نہیں ہے۔

نسخ کے اقسام

قوانینِ شریعت کا یہ قصرِ رفیع چار بنیادوں پر قائم ہے۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔

یہی چار دلیلیں ہیں جن سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کون ناسخ ہوسکتی ہے اور کون منسوخ۔ اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ اجماع اور قیاس ان احکام کو نسخ نہیں کر سکتے، جو نصوص قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ اور مشہورہ سے ثابت ہیں اور اس آیتِ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد نسخ احکام باقی نہیں۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ (المائدہ: ۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تمہیں اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو تمہارے لئے بطور دین و مذہب پسند کرلیا۔

باقی رہیں دو چیزیں کتاب اور سنّت۔ تو یہاں چار احتمال ہیں کتاب کا نسخ کتاب سے سنّت کا نسخ سنّت سے، سنت کا نسخ کتاب اور کتاب کا نسخ سنّت سے۔ پہلے دو بالاتفاق جائز ہیں، اور دوسرے دو میں شافعیوں اور حنفیوں کا اختلاف ہے پہلے دو کی ایک ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (الانفال: ۶۵)

ترجمہ: (میدانِ کارزار میں) اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر سو ہوئے تو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔

اس میں مجاہدین کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہارے مقابل دس گنا تک کفار ہوں تو پھر بھی ان سے مقابلہ کرنا فرض ہے لیکن بعد میں یہ حکم اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ ۔ (الانفال، ٦٦)

ترجمہ: اب اللہ تعالیٰ نے تم پر آسانی کر دی ہے اور تمہاری کمزوری کو جان لیا ہے۔ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ایک ہزار ہوئے، تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔

پہلے اگر دشمن کی تعداد دس گنا ہوتی تو بھی اس کا مقابلہ کرنا فرض تھا۔ اب آسانی فرمادی کہ اگر دشمن دوگنا ہو تو تم پر اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

نسخ سنۃ بالسنۃ کی مثال:

حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

کنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها۔

ترجمہ: پہلے میں تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا لیکن اب تمھیں اجازت ہے بیشک زیارتِ قبور کے لئے جایا کرو۔

حضورؐ کا پہلا حکم جو زیارتِ قبور سے منع کرنے کے متعلق تھا۔ اب اس دوسرے حکم سے منسوخ ہوگیا۔ اب رہیں پچھلی دو شقیں یعنی نسخ السنۃ بالکتاب اور نسخ الکتاب بالسنۃ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دونوں جائز نہیں۔

سنت کا نسخ کتاب سے

احناف نسخ السنۃ بالکتاب کو جائز سمجھتے ہیں اور دلیل کے طور پر تحویلِ قبلہ کی آیت پیش کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو آپ پہلے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ بیت المقدس

کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جو پہلے ثابت تھا اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اے محبوب! اب نماز میں منہ مسجد الحرام کی طرف پھیرلو!

سنّت ناسخِ قرآن نہیں

رہی چوتھی شق یعنی نسخ الکتاب بالسنۃ تو یہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ ان حضرات نے بھی یہی اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حکم اللہ تعالیٰ دے اس کا رسول اسے ساقط العمل قرار دے دے حالانکہ رسول کا فرض تو یہ ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کرے اور دوسروں سے کرائے آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (یونس ۱۵)

ترجمہ: اور جس وقت ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (روز قیامت) ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں (یارسول اللہؐ) اس کے بغیر کوئی اور قرآن لائیے (جو ہماری ہوا و ہوس کے مطابق ہو) یا اسے (ہماری خواہش کے مطابق) تبدیل کر دیجئے آپ فرمائیے مجھے تو اپنی طرف سے قرآن کے بدلنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تو وہی مانتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے مجھے تو خوف ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں۔

اس لئے یہ ناممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو باطل قرار دیں۔ شوافع اور احناف سب اس پر متفق ہیں کہ جو حکم نص قرآنی سے ثابت ہو، حدیث

اس کی ناسخ نہیں ہوسکتی۔ احناف کے ایک مسلمہ امام قاضی ابو زیدؒ نے تصریح کی ہے

لم یوجد فی کتاب اللہ ما نسخ بالسنۃ۔[1]

قرآن کریم کا کوئی ایسا حکم نہیں جو سنت سے منسوخ ہوا ہو۔

اور یہ جو احناف اور شوافع کا اختلاف ہے کہ احناف کے نزدیک سنت ناسخ کتاب ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں تو اس کی وجہ ایک علمی نکتہ ہے وہ یہ کہ

زیادۃ التخصیص علی النص نسخ ام لا

یعنی کتاب اللہ کے ایک عام حکم کو خاص کر دینا کیا یہ نسخ ہے یا نہیں۔

شافعیوں کے نزدیک یہ نسخ نہیں اور حنفیوں کے نزدیک یہ بھی نسخ ہے کیونکہ ان کے نزدیک عام اپنے تمام افراد پر قطعی الدلالۃ ہے اور تخصیص سے حکم بعض افراد سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور بعض پر باقی رہتا ہے اس لئے اس تخصیص سے ان افراد پر جن سے حکم ساقط ہوا گویا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس اختلاف کی وجہ سے شوافع خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص کر لیتے ہیں، لیکن احناف کے نزدیک کیونکہ یہ نسخ ہے اس لئے خبر واحد سے زیادتی منع ہے بلکہ اس کے لئے خبرِ مشہور یا خبرِ متواتر درکار ہے۔

احناف یہ ہرگز نہیں کہتے کہ سنت اس معنی میں ناسخ کتاب ہے کہ ایسا حکم جو نص کتاب سے ثابت ہے اسے بھی ساقط العمل کر دے۔ بلکہ یہاں تو احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کسی عام حکم کی تخصیص جسے شوافع بھی جائز سمجھتے ہیں۔ نسخ سے شمار کیا اور پھر اس کے لئے بھی خبر واحد کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کے لئے خبر مشہور یا متواتر ضروری سمجھی گئی۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

[1] کتاب التحقیق باب النسخ۔

یہ اُصول جو میں نے ذکر کئے ہیں یہ اس بحرِ ذخار کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے جو علماء کبار نے صدیوں کی محنت اور شب بیداریوں سے اپنی اصول کتابوں میں جمع کئے ہیں۔ کرنے کا کام تو یہ تھا کہ ان احادیث کو جن کا تعلق صرف احکام شریعت سے تھا۔ انہیں چُن چُن کر جمع کیا جاتا۔ ان میں سے اخبارِ متواترہ مشہورہ اور اخبارِ آحاد کو الگ الگ کیا جاتا پھر ان سے ان کے مراتب کے موافق احکام مستنبط کئے جاتے۔ یہ کام اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ علماءِ سلف کی کتابوں کی تھوڑی سی ورق گردانی کے بعد گوہرِ مقصود کا ملنا یقینی ہے۔ لیکن کرنے کے کام تو کئے نہیں جاتے کیونکہ ان میں دماغ سوزی سے کام کرنا پڑتا ہے اور یہاں عافیت کوشیوں کے باوجود مصلح اور ریفامر بننے کا جنوں ہوتا ہے تو پھر یہ سوانگ رچانے کے لئے کبھی احادیث کو موردِ طعن بنایا جاتا ہے کبھی محدثین کی شان میں گستاخیاں کی جاتی ہیں اور کبھی ائمۂ فقہ سے دل لگی کی جاتی ہے۔

افسوسناک بات تو یہ ہے کہ جن حضرات کو ذہن رسا اور زورِ قلم کی نعمت بخشی گئی اور وہ ملت کی خدمت کی تمام صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں ان کا اندازِ فکر تخریب کا عادی ہو چلا ہے اور انہیں بنانے سے زیادہ مٹانے میں مزہ آتا ہے۔ یہ المناک منظر دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

ربنا! اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم ۵ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

آمین یا ارحم الراحمین

باب چہارم

چند احادیث پر اعتراضات اور اُن کے جوابات

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ خاتم الانبیاء اشرف المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، قرآنِ کریم کی جو تفسیر حضورؐ نے فرمائی وہ بھی اپنے رب کے حکم سے فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا جیسے قرآن کی اطاعت کا حکم دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح قرآن کو یاد کرنے کی تاکید فرمائی اسی طرح اپنی سنّت کو محفوظ رکھنے کی بھی رغبت دلائی۔ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے قرآن کے ساتھ اپنے رسولؐ کے ارشادات کو بھی واجب العمل یقین کیا۔ وضع واختلاط سے اسی سرچشمہ حیات کو محفوظ رکھنے کے لئے علماء کرام نے اپنی عمریں صرف کر دیں اور نقد و بحث کے وہ قواعد وضوابط وضع کئے جو آج بھی جُویانِ حق کے لئے چراغِ راہ کا کام دے رہے ہیں۔

اس آخری باب میں ہمیں اُن اعتراضات کی طرف متوجہ ہونا ہے جو منکرینِ سنت کی طرف سے مختلف احادیثِ طیبہ پر کئے جاتے ہیں۔

ان اعتراضات سے اگر ان کا مقصد تحقیقِ حق اور تحصیلِ اطمینانِ قلب ہے تو مبارک ہے یہ جذبہ اور لائقِ تحسین ہے یہ شوق۔ اور اگر ان کی غرض ناواقف لوگوں کے دلوں میں اپنے ہادی و مرشد علیہ الصلوٰۃ والثناء کی پیروی سے نفرت وحقارت کی تخم ریزی ہے تو وہ جانیں اور اُن کے سینوں کے پوشیدہ

اسرار جاننے والا علیم وخبیر خدا۔

آئیے ان اعتراضات کا جائزہ لیں کیا ان میں کچھ جان بھی ہے۔

کیا واقعی بعض احادیث کو تسلیم کرنے میں عقلِ سلیم کو جھجک محسوس ہوتی ہے جیسا ان حضرات کا خیال ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ بعض ارشاداتِ نبویؐ آیاتِ قرآنیہ کے مخالف ہیں جیسے ان لوگوں کا گمان ہے؟

مندرجہ ذیل سطور کو بنظرِ غائر دیکھنے کے بعد ان اعتراضات وشبہات کی قلعی کھل جائے گی اور آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ منکرینِ سنّت کے یہ دلائل جن سے آپ آج تک سہمے رہے ساحرانِ فرعون کے تخیلی سانپوں سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔

اذا جاء موسٰی والقی العصا ۔۔۔ قد بطل السحر والساحر

یعنی جب کلیمی حُجّت کا نور ظاہر ہوتا ہے تو سحر و ساحر کی پیدا کردہ ظلمت فنا ہو جاتی ہے۔

پاپائیت اور برہمنیت

آج کل یہ مرض عام ہو رہا ہے کہ ہر کہ ومہ اسلام کے اُصولوں کو اپنی اہواؤں کے وآرا کا پابند بنانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ ہر واقف وناواقف اپنے نظریات کے مطابق عملی احکامِ شرعی کی تاویل کرنا چاہتا ہے، ہر عالم وجاہل مجتہد بننے کی ٹھان رہا ہے نہیں اور اگر عرض کی جائے کہ حضرتِ مشقِ ناز کا ارادہ ہو تو دل وجگر حاضر ہیں لیکن ازلئے لطف وعنایت اس مقدس دین کو کھیل نہ بنائیے تو غضبناک ہو کر فرماتے ہیں کہ اسلام میں (PRIEST HOOD) پاپائیت اور برہمنیت نہیں ہے۔ ہم دینی مسائل میں مُلّا کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتے اندھی تقلید کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب اجتہاد اور بے قید وشرط اجتہاد کا وقت ہے۔ یہ دین بالکل آسان ہے

ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔ اس میں کسی کی استادی کی ضرورت نہیں۔ ان کی [illegible]
غضب کے شراروں سے دامن بچا کر عقل دُور کونے میں کھڑی مُنہ چھپائے [illegible]
رہی ہوتی ہے اور دین ان کی سادہ لوحی پر ہنس رہا ہوتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام پاپائیت اور برہمنیت کی لعنتوں سے پاک ہے۔ مُلا ہو یا
مسٹر اس میں کسی کی اجارہ داری نہیں۔ کوئی نسلی یا خاندانی نسبت کسی کو کوئی تشریعی اور
خصوصی حق نہیں دیتی اور ہر مسلم کا حق ہے کہ وہ علوم اسلامیہ میں تبحر حاصل کرے لیکن
اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام کی نظر میں عالم و جاہل میں کوئی فرق نہ ہو، یا ایک
شخص جس نے ساری عمر اسلامی علوم اور اسرارِ شریعت کے دریافت کرنے میں صرف کی
ہو، اس کا وہی مقام ہو جو ایک ناواقف کا ہے۔ قرآن نے صاف صاف وضاحت فرما دی

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ ۝

کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

اور وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں ان لوگوں کی طرح نہیں جو جاہل ہیں۔

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ عالم و جاہل میں تمیز کی جائے اور اگر ایک شخص کی
رائے کو اس لئے ترجیح دی جاتی ہے کہ وہ شریعت کے اصولوں سے واقف ہے اور
قرآن و سنّت پر اسے کامل عبور ہے تو اسے نہ پاپائیت کہا جا سکتا ہے اور نہ برہمنیت۔
اور اگر ایک شخص کی رائے کو اس لئے درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے کہ اُسے علوم اسلامی
سے کوئی واسطہ نہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہم دین میں مُلا کی اجارہ داری تسلیم کر
رہے ہیں اور خدا اور اس کے بندوں میں واسطوں کے قائل ہیں۔

کیا طب میں فقط ڈاکٹر اور تعمیر میں انجینئر اور قانون میں بیرسٹر کی رائے کو
ہم ترجیح نہیں دیتے اور اگر انجینئروں کی انجمن ڈاکٹروں پر یہ اعتراض شروع کر دے کہ

انہوں نے علاج معالجہ میں اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لی ہے اور ہمیں علاج اور آپریشن
نہیں کرنے دیتے تو کیا آپ فنِ تعمیر کے ان ماہرین کے احتجاج کو غیر معقولیت کی
انتہا نہیں کہیں گے۔

یہی حقیقت اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ملحوظ خاطر رکھئے۔ ایک عالم اس لئے
ہم پر فوقیت نہیں رکھتا کہ وہ فلاں شخص کا لڑکا ہے۔ اور فلاں خاندان کا فرد ہے بلکہ
اس لئے اور فقط اس لئے کہ وہ قرآن و سنّت کا عالم ہے۔ اصولِ شریعت کا ماہر ہے
اور اغراض و اسرارِ تشریع میں مہارت رکھتا ہے۔ اگر یہی پاپائیت اور برہمنیت ہے
تو ع

ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

منکرینِ سنّت کے اعتراضات کی فہرست پر اگر آپ سرسری نظر ڈالیں تو
آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سنّتِ نبویؐ کو
کسی ماہر اُستاد سے حاصل نہیں کیا ورنہ یہ شکوک و شبہات ان کی دماغی پریشانی
کا سبب نہ بنتے۔

کیا آپ نے ان مریضوں کی خستہ حالی کا کبھی اندازہ لگایا ہے جنہیں بدقسمتی
اس طبیب کے پاس لے گئی ہو جس نے فن طب اُستاد سے نہیں بلکہ فقط کتابوں کے
مطالعہ سے حاصل کیا ہو۔ اگر ان تمام دنیوی فنون میں اُستاد کی تربیت اور عملی
رہنمائی کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور انسان ان علوم و فنون میں کمال حاصل نہیں
کر سکتا تو اسی طرح اور بالکل اسی طرح قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے کے لئے
کتابوں سے زیادہ فیضِ نگاہ اور برکتِ صحبت کی ضرورت ہے۔

کسی عالمِ دین کی رائے کو ترجیح دینے کو پاپائیت کہنا اور علومِ دین کو آسان
تصور کر کے کسی فاضل اور ماہر استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہ کرنا ہی دو
باتیں ہمارے افکار کی پراگندگی اور ہماری پیہم ٹھوکروں کا سبب ہیں۔

فصل اوّل

اب آپ معترضین کے اعتراضات اور پھر ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو یقین ہو جائے گا کہ ان اعتراضات کا باعث یا تو جہالت ہے یا فساد فی الدین۔

پہلا اعتراض

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحن احق بالشک من ابراھیم اذ قال رب ارنی کیف تحی الموتی قال اولم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی الخ (رواہ البخاری ومسلم)

وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے:

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہیں، جب انہوں نے کہا تھا۔ اے میرے رب مجھے دکھا تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں۔ آپ نے عرض کی بیشک مجھے یقین ہے لیکن تاکہ میرا دل اور زیادہ مطمئن ہو جائے۔

اس حدیث کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد وہ برافروختہ ہو کر کہتے ہیں کہ یہ حدیث غلط ہے، کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو بھی اس میں شک تھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور حضور کریمؐ کی طرف بھی شک کی نسبت ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک عام مسلمان بھی قدرتِ الٰہیہ میں شک نہیں کر سکتا۔ چہ جائے کہ اولوالعزم انبیاء کے قلوب میں شک کا گزر ہو سکے۔

اس کا جواب

لیکن آپ یقین کیجئے۔ اس حدیث کا یہ معنی ہے ہی نہیں اس سے تو شک کی نفی کی گئی ہے اور شک کی نفی کا اس سے زیادہ بلیغ اور پُرزور انداز ہو ہی نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تو شک کیا، لیکن ہمارے نبی علیہما الصلوٰۃ والسلام نے شک نہیں کیا، تو حضورؐ نے یہ کلماتِ طیبہ فرمائے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی کی۔ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کو شک تھا۔ اس لئے یہ سوال کیا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی وہ شک سے پاک تھے۔ انہوں نے صرف مزید اطمینان کے لئے سوال کیا تھا۔ کیونکہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ابوالانبیاء، معمارِ کعبہ اور بانیٔ ملّتِ اسلامیہ ہونے کے باوجود شک کر سکتے ہیں تو ہمیں بطریقِ اولیٰ شک کرنا چاہیئے لیکن جب ہم یقین کرتے ہیں اور ہمیں شک نہیں جیسے تم جانتے ہو تو حضرت ابراہیمؑ کب شک کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

واما قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحن احق بالشک من ابراھیم، فمعناہ انہ لو کان شاکا لکنا نحن احق بہ ونحن لا نشک فابراھیم علیہ السلام احری الا یشک[1]۔

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا (نَحْنُ اَحَقُّ یعنی ہم حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہیں) یہ معنی ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا ہوتا تو ہم بطریقِ اولیٰ شک کرتے، لیکن ہمیں قطعاً شک نہیں تو ابراہیم علیہ السلام کو کیسے شک ہو سکتا ہے۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ اس حدیث سے شک کا اثبات ہوتا ہے یا نفی کا؟ اور نفی کا اس سے مؤثر اسلوب اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر ہم کسی کلام کا اُلٹا معنی سمجھنے لگیں تو قصوروار کون ہے؟

حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے اس کے علاوہ ایک اور جواب بھی دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

[1] تفسیر الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۳ ص ۲۹۸۔

وحکی بعض علماء العربیۃ ان افعل ھھنا جاءت لنفی المعنی عن الشیئین نحو قولہ تعالیٰ اَھُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ای لاخیر فی الفریقین ونحو قول القائل الشیطان خیر من فلان ای لاخیر فیہما فعلیٰ ھذا فمعنی قولہ نحن احق بالشک الخ ای لاشک عندنا جمیعا۔ (فتح الباری کتاب الانبیاء)

ترجمہ: لغت عربی کے بعض ماہرین سے مروی ہے کہ اَفْعَل کا صیغہ کبھی کبھی دونوں چیزوں سے کسی معنی کی نفی کرنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جس طرح اس میں کفار اور قوم تبع دونوں سے خیر کی نفی کی گئی ہے۔ یا جیسے اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص سے تو شیطان ہی اچھا ہے، جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں برے ہیں۔ ماہرینِ لغتِ عرب کے اس قول کے مطابق نحن احق بالشک سے مقصد شک کی دونوں سے نفی کرتا ہے یعنی نہ ہم نے شک کیا اور نہ ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا۔

امید ہے آپ پر اس اعتراض کی قلعی کھل گئی ہوگی، اور آپ پر واضح ہوگیا ہوگا کہ اس ارشادِ نبویؐ کا کیا مفہوم ہے کاش وہ حضرات یہ اعتراض کرنے سے پہلے کسی جاننے والے کی طرف رجوع کرتے اور اگر معاصرانہ چشمک اپنے ہم عصر علماء سے استفادہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو اسلاف کی کتابوں کا ہی مطالعہ کر لیتے۔ حکمِ الٰہی ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اگر خود نہیں جانتے ہو تو ان سے پوچھو جو جانتے ہیں۔

دوسرا اعتراض

اسی حدیث کے آخری جملہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے، لیجئے وہ اعتراض بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ جملہ ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:-

لو لبثت فی السجن طول لبث یوسف لاجبت الداعی

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-

اگر میں اتنی مدت قید خانہ میں ٹھیرتا جتنی مدت یوسف علیہ السلام ٹھیرے تھے تو میں داعی (بلانے والے) کی دعوت قبول کر لیتا۔

یہاں معترض صاحب کو الداعی کا معنی سمجھنے میں ٹھوکر لگی۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید الداعی سے مراد عزیزِ مصر کی بیوی ہے جس کے حسن وشباب کی فتنہ زائیوں کو نبوت کے تقدس نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ داعی کا یہ مفہوم اگر ذہن میں ہو تو یہ حدیث پڑھ کر سر نہ چکرائے اور دل نہ ڈوبے، تو مقامِ حیرت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس نے ان کو بتایا کہ یہاں داعی سے مراد امرأۃ العزیز ہے، مندرجہ ذیل آیت پڑھئے آپ کو خود بخود الداعی کا معنی معلوم ہوجائے گا۔

وَقَالَ الْمَلِکُ ائْتُوْنِیْ بِہٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَہُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْہُ مَا بَالُ النِّسْوَۃِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَھُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِھِنَّ عَلِیْمٌ ۝ (یوسف: ۵۰)

ترجمہ: بادشاہ مصر نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ۔ تو جب ان کے پاس بادشاہ کا قاصد (بلانے) آیا۔ تو آپ نے کہا اپنے مالک کی طرف لوٹ جا۔ اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کی حقیقت کیا ہے، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے میرا رب تو ان کے فریب سے خوب واقف ہے۔

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے صبر وتحمل، خودداری وعزتِ نفس کی تعریف فرماتے ہیں کہ اتنی مدت دراز تک قید وبند کی سختیاں جھیلنے کے باوجود جب ان کو رہائی کا پیغام پہنچا تو ان کی غیرت نے

برداشت نہ کیا کہ جب تک زنانِ مصر اپنی غلطی کا کھلا اعتراف نہ کرلیں۔ اور ان کے دامنِ عصمت کی طہارت پر شہادتیں نہ دیں وہ قید خانہ سے باہر نکلیں یہاں عزیزِ مصر کی بیوی کی طرف اشارۃ تک نہیں۔ یہاں الداعی سے مُراد بادشاہِ مصر کا وہ قاصد ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کو رہائی کا مژدہ سنانے کے لئے آیا تھا۔ معلوم نہیں، حضرتِ معترض نے کس سند سے یہ رُوح کو لرزا دینے والی تفسیر فرمائی اور اسے ایک من گھڑت الزام حدیث کی طرف منسوب کرنے کی کیسے جرأت ہوئی۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ای لاسرعت الاجابة فی الخروج من السجن ولما قدمت طلب البراءۃ فوصفه بشدۃ الصبر حیث لم یبادر بالخروج۔

وانما قال صلی اللہ علیه وسلم تواضعا والتواضع لا یحط مرتبة الکبیر بل یزیدہ رفعة واجلالا وقد انه قال قبل ان یعلم انه افضل من الجمیع۔ (فتح الباری کتاب الانبیاء)

یعنی حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اس قولِ مبارک کا (لاجبت الداعی) یہ مطلب ہے کہ اگر میں ہوتا تو مجھے جب وہ بُلانے آتا تو میں فوراً قید خانہ سے باہر نکلتا اور میں زنانِ مصر کی شہادت کا انتظار نہ کرتا۔ اور اس سے مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل کی توصیف کرنا ہے۔

اس سے بظاہر یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت یوسفؑ سے افضل و اعلیٰ تھے تو حضور خود ایسا کیوں نہ کرتے۔ اس لئے اس شبہ کو دُور کرنے کے لئے ابن حجر نے دو جواب بھی ذکر کر دیئے یعنی حضورؐ کا یہ ارشاد ازراہِ تواضع و انکسار تھا اور تواضع سے متواضع کی عزت میں کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی عظمت اور جلال میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ اس وقت فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے ابھی مطلع نہیں فرمایا تھا کہ آپ تمام انس و ملک سے افضل ہیں۔

اس کی ایک لطیف حکمت علامہ قرطبی نے ذکر کی ہے جسے خوفِ طوالت کی وجہ سے نہیں لکھ رہا جسے شوق ہو وہ ان کی تفسیر میں ملاحظہ کرے[1]۔

تیسرا اعتراض

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لم یکذب ابراھیم النبی فی شئ قط الا فی ثلاث قوله اِنِّیْ سَقِیْمٌ وقوله لسارۃ اختی وقوله بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُھُمْ۔ (رواہ البخاری ومسلم والترمذی واللفظ للترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم نے جو نبی تھے کبھی کذب (یعنی خلافِ واقع بات) تین بار کے علاوہ نہیں بولا (ایک بار جب کفار نے انہیں اپنے میلے میں شرکت کی دعوت دی تو) آپ نے کہا "انی سقیم" (میری طبیعت ناساز ہے) دوسری بار جب انہوں نے زوجہ محترمہ حضرت سارہ کو اپنی بہن کہا۔ تیسری مرتبہ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان بتوں کو کس نے توڑا تو آپ نے کہا کہ یہ کام بڑے بُت نے کیا ہے۔

اعتراض

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جھوٹ حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اس کی نسبت ایسے جلیل المرتبت رسول کی طرف کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے صِدِّیْقًا نَّبِیًّا فرمایا ہے ظلمِ عظیم ہے، کیونکہ اس حدیث میں جھوٹ جیسے فعلِ شنیع کی نسبت خلیل اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ اس لئے یہ حدیث موضوع ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۹ ص ۲۰۷۔

جواب: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے اور انبیاء کرام اس مذموم فعل سے معصوم ہیں اور ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا ظلم عظیم ہے لیکن اگر حضرت معترض اعتراض کرنے سے پہلے کسی سے پوچھ لیتے یا کسی مستند تفسیر کا مطالعہ فرما لیتے تو اس پریشانی میں گرفتار نہ ہوتے یہ کوفت انہیں اس لئے اُٹھانی پڑی کہ انہوں نے کذب کو جھوٹ کا مترادف سمجھا، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ ان میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔ یعنی کذب عام ہے اور جھوٹ خاص ہے۔ کذب متعدد معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جن میں سے صرف ایک معنی کے لحاظ سے جھوٹ کا مترادف ہے اور دیگر معانی میں اس کا جھوٹ سے جو جرم شنیع اور گناہ کبیرہ ہے کوئی واسطہ نہیں اور اس حدیث میں کذب کا استعمال جھوٹ کے معنی میں نہیں ہوا۔ بلکہ ایک دوسرے معنی میں ہوا ہے اور اس معنی کے اعتبار سے کذب نہ جرم شنیع ہے اور نہ گناہ کبیرہ۔ آئیے پہلے کذب کے مختلف معانی جن میں اہل لغت اسے استعمال کرتے ہیں، کی تحقیق کریں تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔

قال ابن الانباری ان الکذب ینقسم الی خمسة اقسام احداھن تغییر الحاکی ما یسمع وقوله ما لا یعلم نقلا وروایة وھذا القسم ھو الذی یؤثم ویھدم المروۃ و الثانی بمعنی الخطأ وھو کثیر فی کلامھم والثالث البطول کذب الرجل بمعنی بطل علیه امله وما رجاہ۔ الرابع الاغواء والخامس ان یقول قولا یشبه الکذب ولا یقصد به الا الحق ومنه حدیث کذب ابراھیم ثلاث کذبات ای قال قولا یشبه الکذب وھو صادق فی الثلاث۔

(تاج العروس۔ فصل الکاف من باب الباء)

ترجمہ: ابن الانباری نے کہا ہے کہ کذب کی پانچ اقسام ہیں:۔

(۱) متکلم نے جو کچھ سنا ہے اس کے خلاف اگر روایت کرے تو اسے بھی کذب کہتے ہیں (اس معنی میں کذب جھوٹ کا ہم معنی ہے اور یہی قسم گناہ کبیرہ ہے اور شرافتِ انسانی کے منافی ہے۔

(۲) کذب خطأ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کلام عرب میں کذب اسی معنی میں کثیر الاستعمال ہے۔

(۳) آرزو اور اُمید کے خاک میں مل جانے کو بھی کذب کہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ کذب الرجل یعنی اس کی اُمید خاک میں مل گئی۔

(۴) کذب بمعنی اغواء یعنی کسی کو دھوکہ میں رکھنا بھی مستعمل ہے۔

(۵) اور کذب اس قول کو بھی کہتے ہیں جو بظاہر خلاف واقع (جھوٹ) نظر آتا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل مطابقِ واقعہ ہے اور اس معنی میں کذب کا لفظ اس حدیث میں استعمال ہوا جہاں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے۔ کیونکہ آپ کے تینوں اقوال بظاہر خلاف واقعہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں اقوال بالکل درست ہیں۔

ابن الانباری کا قول نقل کرنے کے بعد مصنف نے ان معانی پر کلام عرب سے کئی استشہاد پیش کئے ہیں جن کا مطالعہ طالبانِ علم کے لئے بہت مفید ہوگا۔

جب ہمیں لفظ کذب کے متعدد معانی معلوم ہو گئے۔ جن میں اہل لسان اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو پھر اس حدیث پاک میں لفظ کذب جو مذکور ہے اس کا معنی جھوٹ کرنا سراسر علم دشمنی بلکہ فسادِ نیت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں طالبانِ حق میں سے بنائے اور ہمیں ہمہ دانی کے جھوٹے غرور کی ہلاکتوں سے بچائے آمین۔

اس طرزِ کلام کو علماء معانی تعریض کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر اس کو استعمال کرنے والا فصاحت وبلاغت کے اصولوں سے واقف ہو تو بسا اوقات تعریض کلام کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس کی نظیر ہمیں ایک صحابیہ کے قول میں ملتی ہے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بچہ بیمار تھا۔ ایک دن وہ اپنے کام کو چلے گئے اور اس بچّے نے دم توڑ دیا۔ ان کی رفیقۂ حیات حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے سوچا کہ اب بچّے کے باپ کی واپسی کا وقت ہے اور وہ سارے دن کی محنتِ شاقہ کے بعد تھکے ماندے لوٹیں گے۔ اگر آتے ہی انہیں یہ المناک خبر دی گئی تو ان کے رنج والم کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں بچّے کی وفات کی اطلاع کل صبح دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لختِ جگر کو چارپائی پر لٹا کر اس کے اوپر چادر ڈال دی۔

کچھ دیر کے بعد حضرت ابوطلحہ واپس آئے اور انہوں نے آتے ہی دریافت کیا۔

کیف الغلام؟ (بچہ کیسا ہے؟)

تو اس مجسمۂ تسلیم ورضا نے جواب میں کہا۔

ھدأ نفسہ وارجوان یکون قد استراح۔[1]

یعنی اب اُسے سکون آگیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اب اس کی تکلیف جاتی رہی ہے۔

حضرت ابوطلحہؓ نے یہ سمجھا کہ واقعی اب بچّے کو آرام آگیا ہے چنانچہ انہوں نے وہ رات حسبِ معمول بسر کی۔ صبح وہ جب بیدار ہوئے تو سلیقہ شعار بیوی نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ یہ سن کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُم سلیمؓ کے صبر وتحمل کا واقعہ سننے سے بہت مسرت ہوئی اور حضورؐ نے دُعا فرمائی۔

[1] صحیح البخاری کتاب الادب۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کے صدقے انہیں اور فرزند عطا فرمایا۔

حضرت اُم سلیمؓ کا جواب اس لحاظ سے درست ہے کہ مرنے کے بعد تمام بیماریوں سے نجات مل جاتی ہے لیکن بظاہر جو اس کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ صحیح نہیں اسی کو تعریض کہتے ہیں اور کذب کے پانچ معنوں سے ایک معنی یہ بھی ہے لیکن اسے ہم جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ کذب اور جھوٹ میں جو فرق ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب حدیث کی طرف توجہ فرمائیے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کیا معترض کا اعتراض حقیقت پر مبنی ہے۔ یا قلتِ فکر، اور عدم تدبّر کا نتیجہ ہے؟

یہ بحث ختم کرنے سے پہلے اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان تین اقوال کا مجملاً ذکر کردیا جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

پہلا قول

ان کی قوم کا تہوار تھا۔ سب جمع ہوکر باہر جا رہے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ان کی قوم نے کہا کہ وہ بھی خوشی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے ان کے ہمراہ چلیں۔ آپ نے سوچا کہ آج صنم کدہ پجاریوں سے خالی ہو رہا ہے اور ان پتھر کے معبودوں کی جھوٹی خدائی پر ضرب کاری لگانے کا سنہری موقعہ ہے چنانچہ آپ نے اپنے دل میں کچھ ٹھان کر اپنے ساتھیوں سے فرما دیا کہ میں تمہارے ساتھ جانے سے قاصر ہوں اور اس کی وجہ یہ بتائی: اِنِّیْ سَقِیْمٌ

اس لفظ کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ میں بیمار ہوں اور عام طور پر جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ میں اس وقت بیمار ہوں اور اس لحاظ سے یہ جواب حقیقت کے خلاف تھا کیونکہ آپؑ کو اس وقت کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن یہی صیغہ اس وقت بھی مستعمل ہوتا ہے جب کہ مستقبل میں بیمار ہونے کا اندیشہ یا احتمال ہو تو اس لحاظ سے اس کلام کی صحت میں قطعاً کوئی شبہ نہیں

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○

بے شک تمہیں بھی مرنا ہے اور انہیں بھی مرنا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اور وہ اب مرے ہوئے ہو بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ آیندہ چل کر تمہیں مرنا ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا مقصد بھی یہی تھا کہ مجھے آگے چل کر بیمار ہونے کا اندیشہ ہے، لیکن کفار یہ سمجھے کہ فی الحال بیمار ہیں، یعنی تعریض ہے جو کذب کی پانچ قسموں میں سے ایک ہے لیکن یہ جھوٹ نہیں[1]۔

دوسرا قول

ان کی قوم انہیں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ آپ بت کدہ میں تشریف لے جاتے ہیں وہاں قطار در قطار بُت رکھے ہیں اور ان کے سامنے مٹھائی سے بھرے ہوئے طشت پڑے ہیں۔ اور ان کے وسط میں ایک بڑا بت ہے۔ آپ ایک طرف سے شروع ہوتے ہیں اور تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر کلہاڑا بڑے بُت کے کندھے پر رکھ دیتے ہیں۔

تمام دن دادِ عیش دینے کے بعد شام کو جب پجاری واپس آئے تو اپنے خداؤں کا حشر دیکھ کر انہوں نے کہرام مچا دیا۔ سارے شہر میں سناٹا چھا گیا۔ اُن کے بُت، اُن کے بارش برسانے والے، انہیں رزق دینے والے، انہیں لڑائیوں میں فتح و نصرت دینے والے خدا ریزہ ریزہ کر دیئے گئے تھے۔ مجرم کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر کار حضرت ابراہیمؑ کو پکڑ کر نمرود کے دربار میں لایا گیا اور تحقیق شروع ہوئی۔ آپ سے دریافت کیا گیا:

[1] تفسیر قرطبی ج ۱۵ ص ۹۳۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ

انہوں نے پوچھا اے ابراہیم ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟

تو آپ نے اس بڑے بُت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○

آپ نے کہا میں نے نہیں بلکہ ان کے اس بڑے بُت نے ان کا یہ حال کیا ہے۔ تم ان سے خود پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ کہنا کہ انہوں نے نہیں بلکہ اس بڑے بت نے ان کو توڑا ہے بظاہر خلاف واقع ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ان کو پاش پاش کیا تھا، لیکن اگر سوچا جائے تو خلیل اللہ کا یہ قول ان کے عقائدِ باطلہ کے لئے قنبلۂ ذریہ سے کم نہ تھا۔ علامہ زمخشری اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس جواب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس فعل کی اپنی ذات سے نفی کریں اور بڑے بُت کی طرف اُسے منسوب کریں بلکہ آپ کا مقصد اس فعل کو اپنے لئے ثابت کرنا تھا لیکن اس طریقہ سے کہ ان بت پرستوں پر یوں الزام حجت کریں کہ انہیں اپنے عقائد کے بطلان کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ رہے۔

یہ استدلال بالکل اسی طرح ہے جیسے تو خوش نویس ہو اور چند سطریں بہت خوشخط لکھے اور تیرا ایک بدخط دوست تجھ سے پوچھے کہ کیا یہ تم نے لکھا ہے اور تو استہزاء سے جواب دے کہ نہیں جناب! یہ تو آپ نے لکھا ہے یعنی یہ تو مسلمہ امر ہے کہ تجھ ایسا بدخط ایسا خوبصورت نہیں لکھ سکتا تو پھر میرے بغیر اور کس نے لکھا ہے (بظاہر جس چیز کی نفی ہے حقیقت میں اس چیز کا اثبات ہے)۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ اس اسلوب کلام کو تعریض کہتے ہیں[1]۔

[1] تفسیر الکشاف سورۃ الانبیاء۔

تیسرا قول

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے وطن سے ہجرت فرما کر مصر پہنچے تو آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام آپ کے ہمراہ تھیں، مصر میں اس وقت جو فرعون حکمران تھا اس کے تمرد و طغیان کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کوئی شادی شدہ عورت اسے پسند آتی تو اسے اس کے خاوند سے چھین لیتا، اُس کے چیلوں نے اسے بتایا کہ تیرے ملک میں ایک ایسی خاتون آئی ہے جو تیرے محل کی زینت بننے کے لائق ہے اس نے اپنے سپاہیوں کو بھیجا کہ حضرت سارہ علیہا السلام کو زبردستی لے آئیں۔ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے تو آپ نے فرمایا۔ قال اختی — یہ میری بہن ہے۔ پھر آپ نے حضرت سارہ سے اس کی وجہ بھی بیان فرمادی۔

قال یا سارة لیس علیٰ وجه الارض مؤمن غیری وغیرک
وان ھٰذا سألنی فاخبرته انك اختی الخ

ترجمہ: اے سارہ اس وقت زمینِ مصر میں میرے اور تیرے بغیر اور کوئی مؤمن نہیں ہے اور انہوں نے مجھ سے تیرے متعلق پوچھا ہے تو میں نے انہیں بتایا ہے کہ تو میری بہن ہے (یعنی دین کی بہن)۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا حضرت سارہ کو بہن کہنا بظاہر تو خلافِ واقع ہے لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ جس طرح نسب سے برادری ثابت ہوتی ہے اسی طرح دین سے بھی برادری ثابت ہوتی ہے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول حقیقت کے عین مطابق ہے، اور دینی برادری کے متعلق تو قرآن کریم نے بھی تصریح فرمادی اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کہ تمام مؤمن بھائی بھائی ہیں۔

یہ ہیں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ تین اقوال جن میں آپ

نے تعریض سے کام لیا ہے۔ اور یہ کذب کے پانچ معانی میں سے ایک معنی ہے۔ جن کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ اور انہیں جھوٹ کہنا عربی زبان کے اسالیب بلاغت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ اس لئے ان حضرات کا اس وجہ سے اس حدیث کی تکذیب کرنا اور اسے موضوع ٹھیرانا کہ اس میں خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ثابت ہوتی ہے، بالکل بے معنی ہے۔

چوتھا اعتراض

قدآدم علیہ السلام: حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق حدیث شریف میں مذکور ہے:

قال النبی صلی اللہ علیه وسلم خلق اللہ آدم علیه السلام
وطوله ستون ذراعا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو اُن کا قد ساٹھ ہاتھ تھا۔

اعتراض

اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے قد چھ ساڑھے چھ فٹ سے شاذ و نادر ہی لمبے ہوتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ ہو۔

جواب: لیکن حضرت معترض یہ تو فرمائیں کہ عمر کے متعلق ان کا کیا ارشاد ہے، کنیڈا اور امریکہ جہاں کے لوگوں کی عمریں کافی طویل ہوتی ہیں۔ عمر کا اوسط ستر بہتر سال کے قریب ہے اور ہزاروں میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جس کی عمر سو سال سے متجاوز ہو۔ اور ڈیڑھ سو سال سے زائد تو شاید ساری دنیا میں ایک آدھ ہی ہو اور دو دو صد سالہ پیر فرتوت تو یقیناً آج صفحۂ ہستی پر موجود نہیں۔ لیکن آج سے ہزاروں صدیاں قبل عمر کا اوسط کہیں زیادہ۔ نوح علیہ السلام کی عمر کے متعلق تو قرآنِ کریم میں صاف

تصریح ملتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ
اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝
فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

(العنکبوت: ۱۴،۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ اور وہ ان میں ساڑھے نو سو سال ٹھیرے رہے۔ پھر ان کی قوم کو طوفان نے آلیا (اس لئے) کہ وہ ظالم تھے۔ اس طوفان کے عذاب سے ہم نے نوح علیہ السلام کو اور کشتی میں سوار ہونے والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو سب جہانوں کے لئے ایک درسِ عبرت بنا دیا۔

اگر موجودہ زمانہ میں ساٹھ ہاتھ کے قد کا آدمی نہ ملنا حضرت آدم علیہ السلام کے اتنے قد آور ہونے کی تکذیب کرتا ہے اور حضرت معترض فقط اسی دلیل سے اس روایت کو اساطیرِ کہن سے شمار کرتے ہوئے تمام کتبِ احادیث کو دفاترِ کذب وافتراء کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں تو کل کیا وہ یا ان کا کوئی ہونہار شاگرد یہ کہہ کر قرآن پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچ دے گا کہ قرآن میں تو یہ لکھا ہے کہ حضرت نوح ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرتے رہے اور عمر کی اتنی طوالت تو ہمارے مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے یہ آیت بھی (معاذ اللہ) محدثین نے قرآن میں ملا دی ہے۔ جس کا منطقی نتیجہ وہ نہایت آسانی سے یہ نکال سکتے ہیں کہ جب ایک آیت مشکوک ہو گئی ہو تو باقی قرآن کی صداقت کا کیا اعتبار؟

اتفاق کی بات ہے انہیں دنوں میں امریکہ کے دانتوں کے ماہر ڈاکٹروں کا چورانواں (۹۴) سالانہ جلسہ ہوا جس میں انہوں نے دانتوں کے متعلق اپنی نئی تحقیقات

کا جو انکشاف کیا وہ یہاں کے روزنامہ المصری میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ عرض کرتا ہوں۔ شاید اسی سے حضرت معترض کو تسلی ہو جائے۔

"امریکہ میں دانتوں کے ماہر ڈاکٹروں نے اپنے چورانوے جلسہ میں اعلان کیا کہ انسانی جسم میں جو تطور اور تغیر ہو رہا ہے۔ اس کا دانتوں پر بھی اثر پڑا ہے۔ قدیم انسان کے دانتوں کی تعداد چالیس تھی اس لئے اس کے جبڑے بھی بہت بڑے تھے تاکہ دانتوں کی یہ تعداد ان میں سما سکے۔ اس وقت انسان کے دانتوں کی تعداد بتیس ہے۔ اسی لئے اب اس کے جبڑے پہلے کی نسبت سے چھوٹے ہیں۔

ان ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ اس تطور کے باعث دس لاکھ سال کے بعد دانتوں کی تعداد بیس رہ جائے گی اور انسان کے چہرے کا حجم موجودہ حجم سے نصف رہ جائے گا۔"

(المصری، قاہرہ۔ مصر۔ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۸

اس تطور اور تغیر کا اثر صرف دانتوں تک محدود نہیں رہے گا، باقی جسم بھی متاثر ہوگا۔ اگر ان ماہرین کا اندازہ درست ہوا تو انسان کا قد بھی موجودہ قد سے آدھا رہ جائے گا۔

مجھے ان ماہرین کے اس اعلان سے سروکار نہیں، میں تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آدم علیہ السلام کے اتنے قد آور ہونے پر موجودہ علمی تحقیقات کو کوئی اعتراض نہیں تو ہم مسلمان ہو کر اس بات کی تکذیب کیوں کریں جو ہمارے صادق و امین رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحیح طور پر ثابت ہے۔

فصل دوم

اس سے پہلے جن احادیث کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسی تھیں جن کا احکام شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اب ان اعتراضات کی طرف توجہ کرنا ہے جن کا تعلق ان احادیث سے ہے جن پر شریعتِ اسلامی کے نہایت اہم مسائل کی دار و مدار ہے۔ منکرین سنت کی اصلی غرض بھی ان احادیث کو رد کرنا ہے کیونکہ وہ اُن کو (غلطی سے یا دانستہ) کبھی قرآن کے خلاف بتاتے ہیں اور کبھی ان پر مصلحتِ وقت کے خلاف ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ اس لئے ان احادیث پر اعتراض کرتے وقت وہ اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ ان کے یہ اعتراضات کہاں تک حقیقت پر مبنی ہیں؟

پانچواں اعتراض۔ شادی شدہ زانی کے رجم کا مسئلہ

اعتراض: حضرت معترض فرماتے ہیں کہ کتبِ احادیث میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم یعنی سنگسار کرنے کی سزا ہے اور یہ قرآنِ کریم کے حکم کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے یہ مجموعہائے حدیث جن میں مخالفِ قرآن احکام درج ہیں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ اور چونکہ رجم کی سزا قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔

جواب۔ اس سے پیشتر کہ اس اعتراض کا جواب شافی بعونہٖ تعالیٰ عرض کروں تمہیدًا ایک چیز گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ اُمتِ اسلامیہ میں جس نے سب سے پہلے رجم کا انکار کیا، وہ خارجی فرقہ ہے۔ تاریخِ اسلام کے ایک ابتدائی

طالبِ علم سے بھی یہ امر مخفی نہیں کہ وحدتِ ملی میں سب سے پہلے انشقاق اور اختلاف پیدا کرنے کا سہرا انہیں خوارج کے سر ہے۔ زہد و تقشف اور ورع و تقویٰ کے غرور نے ان کی عقلوں پر ایسے پردے ڈال دیئے کہ منہاجِ نبوت سے روگردانی کر کے اپنے آراء و افکار کی دہلیزوں پر سجدہ ریز ہو گئے۔ کچھ مدت امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ رہے۔ پھر جب آپ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرنے کے لئے وہ حکم مقرر کئے تو ان عقل کے اندھوں کو پندارِ علم لے ڈوبا۔ اور اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ سے استدلال کرتے ہوئے شیرِ خدا کی تکفیر کا فتویٰ جڑ دیا اور بارہا حضرت امیر المؤمنین سے برسرِ پیکار ہوئے۔ اور یہ شقاوت بھی ان بدنصیبوں کے حصہ میں لکھی تھی کہ ان کی تلوار حضرت کے خون سے رنگین ہوئی۔

ہمیشہ ان کی فتنہ زائیوں سے چمنستانِ اسلام کے گلہائے شگفتہ کے دامن تار تار ہوتے رہے۔ قصرِ شریعت میں ان کی شکست و ریخت کو دیکھ کر تو اہلِ دل کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہمہ دانی نے جو نئے نئے گل کھلائے ہیں ان میں سے چند ایک ملاحظہ فرمائیے:۔

ابطلوا رجم المحصن وقطعوا يد السارق من الابط و اوجبوا الصلاة على الحائض في حال حيضها وكفروا من ترك الامر بالمعروف و النهي عن المنكر ان كان قادرا وان لم يكن قادرا فقد ارتكب الكبيرة وحكم مرتكب الكبيرة عندهم حكم الكافر و كفوا عن اموال الذمة وعن التعرض لهم مطلقا وفتكوا فيمن نسب الى الاسلام بالقتل والسبي والنهب۔

اجتمعوا علی ان من لا یعتقد معتقد ھم یکفرو
یباح دمہ ومالہ وعرضہ[1]۔

ترجمہ "خوارج نے شادی شدہ زانی کے رجم کو باطل کر دیا اور چور کا ہاتھ بغل سے کاٹتے۔ حائضہ عورت پر حالتِ حیض میں نماز فرض کی، جو نیکی کا حکم نہ کرے اور برائی سے نہ رکے اور اس کی طاقت رکھتا ہو، اس کی تکفیر کا حکم کرتے۔ اور جو طاقت نہ رکھنے کے باعث خاموش رہے اسے گناہِ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا۔ اور اُن کے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔ ذمیوں کے مال سے انہوں نے اپنے ہاتھ روک لئے اور مسلمانوں کو علی الاعلان قتل کرنا اور قید کرنا اور لوٹنا شروع کر دیا۔
اور جو اُن کا ہم عقیدہ نہ ہو اُسے متفقہ طور پر کافر قرار دیتے اور اس کا خون، مال اور اہل اپنے لئے مباح سمجھتے۔"

ایسے باغی گروہ کا تمام اُمت کے خلاف کوئی قول کرنا ہی اس قول کے بطلان کے لئے کافی ہے لیکن میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ ان کے تمام دلائل ان کے سامنے پیش کر کے پھر انشاءاللہ ان کا رد کروں گا تاکہ آپ کو یقین ہو جائے کہ حق وہی ہے جو ساری اُمتِ اسلامیہ کا مسلک ہے۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ زانی خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اس کی سزا صرف سَو درے ہیں۔ شادی شدہ کو رجم کی سزا دینا درست نہیں اور اپنے خیال کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے کئی ایک دلائل پیش کئے ہیں۔

خوارج کی پہلی دلیل: سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کی زنا کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

[1] فتح الملہم شرح صحیح مسلم۔

وَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ

یعنی لونڈیوں کی سزا محصنات کی سزا کا نصف ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ محصنات کا معنی شادی شدہ عورتیں ہیں۔ اور اگر ان کی سزا رجم ہوتی، تو لونڈی کی سزا نصف رجم ہونا چاہئے، حالانکہ رجم کی تنصیف ناممکن ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ محصنات (شادی شدہ) کی سزا سو درے ہیں اور انہیں سو دروں کا نصف یعنی پچاس دُرّے لونڈیوں کی حدّ زنا ہے، تو اس آیت سے صراحۃً معلوم ہو گیا کہ محصنات (شادی شدہ) اگر زنا کی مرتکب ہوں تو انہیں رجم نہیں بلکہ درے لگائے جائیں گے۔

ردِ دلیلِ خوارج: ان کی اس مایہ ناز دلیل کا دارومدار اس پر ہے کہ محصنات کا معنی صرف شادی شدہ ہے۔ آیئے ذرا اس لفظ کی تحقیق کریں تاکہ حقیقت واشگاف ہو جائے۔

محصنات کا مفرد محصنۃ اور اس کا ماخذ اشتقاق احصان ہے اور اہلِ لغت نے اس کا لغوی معنی یوں بیان کیا ہے:

الاحصان فی اللغۃ المنع وکذٰلک الحصانۃ۔ یقال مدینۃ حصینۃ ودرع حصینۃ ای مانعۃ صاحبھا من الجراحۃ۔ (مفردات راغب)

یعنی احصان کا لغوی معنی منع کرنا یعنی روکنا ہے اور حصانۃ کا بھی یہی معنی اس لئے اس شہر کو جو اپنے باشندوں کو دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھے مدینۃ حصینۃ کہتے ہیں۔ اور وہ زرہ جو حملہ آور کے وار کو روک لے اور اپنے پہننے والے کو زخم سے بچائے اسے درع حصینۃ کہا جاتا ہے۔

یہ لفظ اکثر ایسے مرد اور عورت کی صفت واقع ہوتا ہے جو اپنے آپ کو زنا اور

بدکاری سے روکے رکھے۔ اور اس کے قریب تک نہ پھٹکے۔ وہ مرد یا عورت جو زنا سے رکی رہتی ہے اس کے رکنے کے کئی ایک اسباب ہیں۔ اس لئے جس شخص میں ان اسباب میں سے کوئی سبب پایا جائے اسے محصن کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ تاج العروس لکھتے ہیں:

واصل الاحصان المنع والمرأۃ تکون محصنة بالاسلام والعفاف والحریة والتزویج۔[1]

یعنی احصان کا اصلی معنی تو منع کرنا اور روکنا ہے۔ اور عورت جب مسلمہ ہو تو اسے محصنة کہا جاتا ہے (کیونکہ اسلام اسے بدکاری سے روکتا ہے) اگر پاکباز ہو تب بھی اسے محصنة کہا جاتا ہے (کیونکہ اس کی عفت اور پاکبازی اسے اس فعل سے روکتی ہے) اگر آزاد ہو تب بھی اسے محصنة کہا جاتا ہے (کیونکہ آزاد عورت زنا کے قریب نہیں جاتی) اور اگر شادی شدہ ہو تب بھی اسے محصنة کہا جاتا ہے (کیونکہ زواج بھی عورت کو اس سے باز رکھتا ہے)۔

اس لغوی تحقیق سے یہ واضح ہو گیا کہ لفظ محصنة کا استعمال صرف شادی شدہ عورت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ جو عورت اسلام، عفت اور حریت کی اوصاف سے متصف ہو اسے بھی محصنة کہا جاتا ہے۔ خود قرآن کریم میں یہ لفظ ان متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔

جس طرح امام ابن جریر طبری نے اس کی تصریح کی ہے:

الاحصان قد یکون بالحریة کما قال جل ثناؤہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ویکون بالاسلام کما قال تعالیٰ ذکرہ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ۔

[1] تاج العروس: فصل الحاء من باب النون۔

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ ویکون بالعفة کما قال جل ثناؤہ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الخ ویکون بالزوج۔[1]

یعنی احصان کبھی حریت[1] سے حاصل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ الخ وہ آزاد عورتیں جو ان میں سے ہیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور کبھی اسلام[2] سے جیسے آیت فَاِذَآ اُحْصِنَّ الخ میں ہے یعنی جب وہ اسلام لے آئیں اور کبھی عفت و پاکبازی سے جیسے اس آیت میں وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الخ یعنی جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور کبھی احصان شادی[4] سے حاصل ہوتا ہے (جیسے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ یعنی شادی شدہ عورتیں۔

ہم نے دیکھا کہ 'احصان' کی صفت کا تحقق کئی اسباب سے ہو سکتا ہے اور اگر کسی مرد یا عورت میں ان اسباب میں سے کوئی ایک سبب پایا جائے تو ہم اسے محصن (مرد کو) اور محصنة (عورت کو) کہہ سکتے ہیں۔ اور احصان صرف شادی شدہ عورت سے مختص نہیں۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس آیت میں جس کو خارجیوں نے بطور استدلال پیش کیا ہے المحصنات کا کیا معنی ہے۔

اس میں دو قول ہیں ایک اس نبی اکرم کا جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل فرمایا اور اس کے مفہوم سے آگاہ کیا، اس کے صحابہ، خلفاء راشدین اور تمام امت کا اور دوسرا قول ہے۔ خوارج کا جن کی عاقبت نا اندیش حرکتیں اور خطرناک لغزشیں محتاج بیان نہیں۔

حضرت معترض! خود ہی بتائیں صحیح قول کونسا ہوگا۔ اگر پہلا صحیح ہے تو پھر آپ کو

[1] جامع البیان للامام ابن جریر الطبری ج ۵ ص ۶۔

تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس آیت میں المحصنٰت کا معنی الابکار الحرائر[1] ہے یعنی وہ عورتیں جو باکرہ اور آزاد ہیں۔ اور ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لونڈیوں کی زنا کی سزا باکرہ حرہ کی سزا کا نصف ہے۔ اور باکرہ (غیر شادی شدہ) کی سزا جب سو دُرّے ہے تو لونڈی کی سزا پچاس درے ہوگی۔

اور اگر آپ حضور کریم علیہ وعلیٰ آلہٖ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشاد کی موجودگی میں خارجیوں کے متعین کردہ معنی کو ہی ترجیح دینے پر مُصر ہوں تو پھر ہمیں آپ (حضرت معترض) سے کوئی شکایت نہیں۔

ہمارے اس دعویٰ کی کہ سنت نبوی کی اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن کے الفاظ کے معانی کا تعین پیروی سنّت کے بغیر ناممکن ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خوارج کی دوسری دلیل، اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (النور)

ترجمہ: زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو سَو سَو درے لگاؤ۔

خارجی کہتے ہیں کہ یہاں مطلق زانی اور زانیہ کی سزا سو درے مقرر کی گئی ہے، اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ اور رجم والی حدیث خبر واحد ہے۔ اس عام حکم کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں۔ اس لئے یہاں الزانیۃ والزانی سے غیر شادی شدہ مراد لینا قطعاً درست نہیں۔ آیت اپنے اطلاق پر رہے گی اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔

ردِ دلیلِ دوم: گزشتہ باب میں مفصّل عرض کیا جا چکا ہے، کہ حدیث آیتِ قرآنی کی مخصص ہو سکتی ہے یا نہیں۔ وہاں بتایا گیا کہ خبر متواتر چونکہ قطعی ہے اس

لہ تفسیر القرطبی ج ۵ ص ۱۴۵۔

لئے یہ مخصص ہو سکتی ہیں اور خبر واحد چونکہ ظنی ہے اس لئے وہ آیت کی جو قطعی ہوتی ہے مخصص نہیں ہو سکتی اور یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس سے خوارج کو بھی یارائے انکار نہیں اس لئے انہوں نے یہی اعتراض کیا کہ حدیث رجم خبر واحد ہے اس لئے مخصص نہیں۔ اگر حدیث رجم خبر متواتر یا مشہور ہو تو پھر ان کے نزدیک بھی تخصیص آیت جائز ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے یا مرتبۂ تواتر و شہرت کو پہنچ چکی ہے۔

قال ابوبکر الرازی روی الرجم ابوبکر و عمر و علی وجابر بن عبید اللہ وابو سعید الخدری وابو ہریرۃ و بریدۃ الاسلمی وزید بن خالد فی اٰخرین من الصحابۃ[1]۔

ترجمہ: ابوبکر الرازی کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل صحابہ نے حدیث رجم کی روایت کی ہے: حضرت ابوبکر، عمر، علی، جابر بن عبیداللہ، ابو سعید خدری، ابوہریرہ، بریدۃ الاسلمی اور زید بن خالد رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

ان جملہ صحابہ نے فقط اس حدیث کی روایت ہی نہیں کی بلکہ خلفاءِ راشدین نے اپنے اپنے عہد خلافت میں اس پر عمل فرما کر اس کی قطعیت ثبوت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی اور علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح فرمائی ہے۔

اجمع الصحابۃ وائمۃ الامصار علی ان المحصن اذا زنی عامداً عالماً مختاراً فعلیہ الرجم۔

ترجمہ: تمام صحابہ اور بلادِ اسلامیہ کے تمام اماموں کا اس پر اجماع ہے کہ اگر شادی شدہ مرد قصداً جان بوجھ کر بلا جبر و اکراہ زنا کا مرتکب ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔

لہ احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۳۲۴۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ خوارج کا حدیثِ رجم کو خبرِ واحد قرار دے کر اس سے انکار سراسر فریب اور دھوکہ ہے۔

اس کے باوجود اگر خوارج اس بات پر مُصر ہوں کہ کیونکہ آیت مطلق و عام ہے اس لئے اگرچہ احادیثِ متواترہ و مشہورہ موجود ہیں لیکن ہم اس کی عمومیت پر ہی عمل کریں گے، تو عرض ہے کہ کیا احادیث کو متروک قرار دینے کے بعد بھی وہ آیت کے عموم پر عامل رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اگر مجنون یا جو کسی جابر ظالم کی تہدید سے مجبور ہو کر یا نادانستہ (یعنی اسے اپنی بیوی خیال کر کے) اس فعلِ شنیع کا مرتکب ہو تو اسے سزا نہیں دی جائے گی حالانکہ آیت میں استثناء مذکور نہیں۔ تو یہ کس قدر اچنبہ ہے کہ اپنی رائے سے تو آیت کی تخصیص کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی لیکن اگر وہ نبیٔ صادق احکام الٰہیہ کی تبیین بقولِ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ فرماتا ہے تو اس پر ناک بھوئیں چڑھائے جاتے ہیں ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

خوارج کی تیسری دلیل ہم مانتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں رجم کیا گیا لیکن یہ اس آیت کے نزول سے پیشتر ہوا۔ آیت تجلید نازل ہونے کے بعد وہ حکم منسوخ ہو گیا۔

ردِ دلیل سوم: خوارج کا یہ تسلیم کرنا کہ عہدِ رسالت میں بھی رجم ہوا یہ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ احادیث خوارج کے نزدیک بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں اور ان کے تواتر و شہرت کی وجہ سے ان کو بھی یارائے انکار نہیں۔ اتنا تسلیم کرنے کے بعد انہیں لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رجم اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی ہوا۔ کیونکہ آیت تجلید (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي الخ) غزوہ بنو مصطلق سے واپسی پر جب کہ واقعہ افک پیش آیا، نازل ہوئی اور غزوہ بنو مصطلق صحیح روایات کے مطابق ۵ھ میں ہوا۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ آیت ۵ھ ہجری میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ماعز کے

رجم کے راوی حضرت ابن عباس ہیں اور ابن عباس ۹ھ میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔

عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال لما اتی ماعز بن مالک النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم قال له لعلك قبلت او غمزت او نظرت؟ قال لا یا رسول اللہ قال انکتها لا یکنی قال نعم فعند ذلك امر برجمه (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت ماعز بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زنا کا اعتراف کیا تو حضورؐ پر نور نے اسے فرمایا کہ شاید تم نے صرف بوسہ لیا ہو یا کنکھیوں سے اشارہ کیا ہو یا دیکھا ہو (اور اسی کو اپنے زہد و ورع کے باعث زنا سمجھ بیٹھے ہو) ماعز نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ ایسا نہیں ہوا۔ پھر حضورؐ نے استفسار فرمایا کیا تو نے واقعی اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کیا ہے تو اُس نے پھر اعتراف کیا، اس کے بعد حضورؐ نے اس کے رجم کرنے کا حکم دیا۔

دوسری حدیثِ رجم کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں جو ۷ھ میں شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے۔

قال اخبرنی عبید اللہ انه سمع ابا هريرة و زید بن خالد قالا کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انشدك الله الا قضیت بیننا بکتاب اللہ فقام خصمه وکان افقه منه فقال اقض بیننا بکتاب اللہ واذن لی۔ قال قل۔ قال ان ابنی کان عسیفا (اجیرا) علی هذا فزنی بامرأته فافتدیت منه بمائة شاة وخادم ثم سألت

رجالا من اهل العلم فاخبرونی ان علی ابنی جلد
مائة وتغریب عام وعلی امرأته الرجم فقال النبی
علیه الصلوٰة والسلام والذی نفسی بیده لاقضین
بینکما بکتاب الله جل ذکره المائة شاة والخادم
رد علی ابنك جلد مائة وتغریب عام واغد یا
انیس علی امرأة هٰذا فان اعترفت فارجمها فغدا
علیها فاعترفت فرجمها (بخاری)

ترجمہ: مجھے عبیداللہ نے بتایا کہ میں نے ابوہریرہؓ اور زید بن خالد سے سُنا کہ ہم بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے۔ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ خدا کے لئے کتاب اللہ کے مطابق ہمارا فیصلہ فرمائیے! اس کا مقابل (مدعیٰ علیہ) اُٹھا اور وہ اُس سے زیادہ عقل مند تھا اس نے عرض کی یا رسول اللہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیے۔ اور مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ حضورؐ نے اُسے عرض کرنے کی اجازت دی۔ وہ کہنے لگا کہ میرا لڑکا اس شخص کے پاس اُجرت پر کام کیا کرتا تھا اور اس نے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کیا۔ میں نے اس کے فدیہ میں ایک سو بکری دی اور ایک غلام آزاد کیا۔ پھر میں نے اس کے متعلق اہلِ علم سے دریافت کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے لڑکے کو سو دُرّے لگیں گے اور ایک سال اسے جلاوطن کیا جائے گا۔ اور اس کی بیوی کو سنگسار کیا جائے گا حضورؐ نے یہ سُن کر فرمایا مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے۔ میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کروں گا۔ سو بکری اور وہ غلام تجھے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ اور تیرے لڑکے کو سو دُرّہ لگایا جائے گا۔ اور ایک سال کے لئے اسے جلاوطن کیا جائے گا۔ اے اُنیس

(ایک صحابی کی طرف روئے سخن فرما کر) تو اس آدمی کی عورت کے پاس جا کر دریافت کر اگر وہ زنا کا اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو۔ چنانچہ اُنیس اس کے پاس گئے، اُس نے اعترافِ جرم کیا اور اُسے رجم کیا گیا۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ جس وقت حضورؐ نے اس عورت کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا تو اس وقت حضرت ابوہریرہؓ موجود تھے تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ۷ھ کے بعد کا ہے۔ اور وہ آیت (اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ) ۵ھ میں نازل ہوئی تو خوارج کا یہ کہنا ہرگز قابلِ قبول نہیں، کہ اس آیت کے نزول کے بعد رجم نہیں کیا گیا۔

نیز ان خط کشیدہ الفاظ کو ذرا پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی، کہ حضورؐ کا فیصلہ کتاب اللہ کا فیصلہ ہے۔ خواہ وہ کتاب اللہ میں مذکور نہ بھی ہو، ورنہ حضورؐ کا حلفیہ فرمانا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا اور پھر رجم کا حکم دینا جو قرآن کریم میں مذکور نہیں بالکل بے جوڑ ہوگا۔ اہلِ بصیرت کے لئے اتباعِ سنت اور سنت کا بھی فرمانِ الٰہی ہونے کے لئے ان الفاظ سے بڑھ کر اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کے بل بوتے پر خارجیوں نے ایک متفقہ علیہ مسئلے کا انکار کر کے ملت میں تشتت و افتراق کی تخم ریزی کی۔ یہ دلائل بھی آپ نے دیکھ لئے اور اُن کا رد بھی ملاحظہ فرما لیا۔

شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی حدِ زنا میں یہ فرق جس طرح کتاب و سنت کے مطابق ہے اسی طرح عقلِ سلیم بھی اسی کی متقاضی ہے۔

سزا کی نوعیت جرم کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر جرم سنگین ہے تو سزا بھی سخت اور اگر جرم خفیف قسم کا ہے تو سزا میں بھی ضرور نرمی ملحوظ رکھی جائے گی۔ غیر

شادی شدہ زانی سے شادی شدہ زانی کا جُرم بلاشبہ سنگین تر ہے۔ اس کی بیوی ہے بچے ہیں۔ اس کے باوجود جذبۂ ہوس رانی کو ضبط نہیں کرتا بلکہ مست ہاتھی کی طرح دندناتا پھرتا ہے اور معصوم عصمتوں کی غارتگری میں مشغول ہے نیز شادی کے بعد بھی اگر مرد یا عورت اس فعل سے باز نہ آئے تو اس کے اثراتِ بد صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ کیا آپ نے آباد گھروں کو اُجڑتے نہیں دیکھا۔ قتل وغارت کی المناک داستانیں نہیں سُنیں، بے بس اور بے کس بچوں کو نہیں دیکھا جو اپنے باپ یا ماں کی غلطی کی وجہ سے دربدر پھرتے ہیں۔ ان کی زندگی جہنم بنی ہوتی ہے اور مستقبل تاریک!

شادی شدہ شخص ایسی عبرتناک سزا کا مستحق ہے جس کی وجہ سے پھر کسی کو ایسا کرنے کی ہمت ہی نہ ہو۔ جس پر انعام زیادہ اس پر گرفت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے سُنا نہیں۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ۔

ترجمہ: اے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی بیبیو! اگر تم میں سے کسی نے غلطی کی تو اسے دُگنا عذاب دیا جائے گا۔

دیکھا آپ نے! ازواجِ مطہرات پر چونکہ انعام زیادہ تھا اس لئے انہیں ان کی امکانی خطا پر دوگنے عذاب کا حکم سنایا گیا۔

عصمت وآبرو کی حفاظت کا یہ اصول اور غیرت وحمیّت کا یہ سبق اسلام نے ہی سکھایا، اور اس جُرم کو شرک اور گناہ کے برابر رکھا گیا۔ بلکہ تہمتِ زنا پر اسّی (۸۰) دُرّے کی سزا کا مقرر کرنا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سب سے سنگین ترین جُرم ہے اور اس سے کسی کو بلاوجہ متہم کرنا ایسی سزا کا موجب ہے

جو تہمتِ شرک وقتل پر نہیں۔

اگر رجم پر ان کا اعتراض خوارج کے خیالات کی صدائے بازگشت ہے تو اس کا جوابِ شافی بعونہٖ تعالیٰ ہو چکا۔ اگر اُن کو یہ گھبراہٹ ہے کہ یورپ کی انسانیت کُش تہذیب انہیں معرضِ طعن بنائے گی تو پھر ان کی پریشانی بے محل ہے۔ ان کے نزدیک متاعِ عصمت کوڑی سے بھی کم قیمت ہے اور ہمارے نزدیک اس موتی کی پاکیزہ شعاعوں کے سامنے مہر وماہ کی تابندگی بھی شرمندہ ہے، عقائد ونظریات کے اتنے بُعد کے باعث ہمارے اعمال وافکار کا یہ فرق بے محل نہیں۔

اس فعلِ بد کے عام ارتکاب سے یورپ جن ہلاکتوں میں گرفتار ہے کیا وہ ہمارے لئے موجبِ عبرت نہیں۔

چھٹا اعتراض اور اس کا جواب

حدیث بول الابل: منکرینِ سنّت نے اس حدیث شریف کو بھی اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا ہے:-

عن انسؓ قال قدم اناس من عكل او عرينة فاجتوؤا المدينة فامرهم النبى عليه الصلوٰة والسلام بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها فانطلقوا فلما صحوا قتلوا راعى النبى عليه الصلوٰة والسلام واستاقوا النعم فجاء الخبر فى اول النهار فبعث فى اثارهم فلما ارتفع النهار جيئ بهم فامر فقطع ايديهم وارجلهم وسمرت اعينهم والقوا فى الحرة يستسقون فلا يسقون۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ قبیلہ عکل یا عرینہ کے چند لوگ مدینہ پاک

میں حاضر ہوئے، لیکن وہاں کی آب وہوا انہیں موافق نہ آئی اور وہ بیمار
ہوگئے) حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہاں جانے کا حکم دیا جہاں
بیت المال کی دودھ والی اونٹنیاں چرتی تھیں، اور انہیں فرمایا کہ تم ان
اونٹنیوں کا بول اور دودھ پیا کرنا۔ وہ وہاں چلے گئے اور ایسا کرنے سے
جب وہ تندرست ہوگئے تو انہوں نے اس چرواہے کو قتل کر دیا اور
اونٹنیاں لے کر بھاگ گئے۔ صبح سویرے اس کی اطلاع حضورؐ کو ہوئی۔
حضور کریمؐ نے ان کے تعاقب میں سوار بھیجے۔ جب کافی دن چڑھ آیا تو
وہ سوار ان کو پکڑ کر لے آئے۔ حضورؐ کے حکم سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے
گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری گئی۔ انہیں دھوپ میں ڈال
دیا گیا۔ وہ پانی طلب کرتے تھے اور انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔

اس پر ان کو یہ اعتراض ہے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں
کاٹ کر ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر دھوپ میں پھینک دیا جائے اور
وہ پیاس سے تڑپتے رہیں لیکن انہیں پانی تک نہ دیا جائے۔ اگر وہ تھوڑی سی
زحمت اٹھاتے اور کتبِ احادیث میں اس اجمال کی تفصیل تلاش فرماتے تو اس
غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ ان ستمگروں نے ان چرواہوں کے ساتھ کیا سلوک
کیا اس کے لئے مندرجہ ذیل سطور پر نظر ڈالئے۔

فی طبقات ابن سعد ارسل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
فی اثرھم کرز بن جابر الفھری ومعه عشرون فارسا
وکان العرینیون ثمانیة وکانت اللقاح ترعی بذی الجدر
ناحیة بقبا قریبًا من نمیر علی ستة امیال من المدینة
فلما غدوا علی اللقاح ادرکھم یسار مولی رسول اللہ

صلی اللہ علیه وآله وسلم ومعه نفر فقاتلھم فقطعوا
یده ورجله وغرزوا الشوك فی لسانه وعینه حتی مات
ففعل بھم النبی صلی اللہ علیه وسلم کذلك۔

(عمدة القاری جزء ثالث)

ترجمہ: طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے
تعاقب میں کرز بن جابر الفہری کو بیس سواروں کے ساتھ بھیجا۔ ان
اہلِ عرینہ کی تعداد آٹھ تھی۔ وہ شیر دار اونٹنیاں ذی الجدر میں چرتی تھیں،
یہ جگہ مدینہ طیبہ سے چھ میل دور قبا کے نواح میں تھی۔ سب سے پہلے حضورؐ
کے آزاد کردہ غلام یسارؓ نے بمعہ اپنے چند رفقا کے انہیں جالیا اور اُن
سے لڑنا شروع کر دیا۔ ان ظالموں نے حضرت یسارؓ کے ہاتھ پاؤں کاٹ
دیئے اور ان کی زبان اور آنکھوں میں کانٹے چبھو دیئے اور اس حالت میں
انہیں پھینک دیا اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ جس
وقت مجرم گرفتار ہو کر عدالتِ نبوت کے کٹہرے میں کھڑے کئے گئے تو
اقلیم عدل وانصاف کے شہنشاہؐ نے ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرنے کا
حکم دیا جو انہوں نے کیا تھا۔

حضرتِ معترض! میں آپ کو جج تصوّر کرتا ہوں اور آپ کو انصاف کی کرسی
پر بٹھا کر آپ کے سامنے ایک مجرم پیش کرتا ہوں جس کا فردِ جرم (CHARGE SHEET)
کچھ اس طرح ہے۔

وہ ایک بیمار تھے جس کے شفایاب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ایک حکیم
حاذق نے اس کا مفت علاج کیا۔ اس کی رہائش اور غذا کا بلا معاوضہ انتظام کیا اور
اپنے خدام کو حکم دیا کہ اس کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔

وہ لاعلاج مریض اُس حکیم کی کوششوں سے تندرست ہوگیا۔

بجائے اظہارِ تشکر و امتنان کے اس شخص نے اپنے محسن طبیب کے ان خادموں کو جو ہر وقت اس کی خدمت گزاری میں سرگرم رہے، بیدردی سے قتل کردیا۔

حکومتِ وقت نے اس کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس کو بھیجا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو حوالۂ پولیس کر دیتا، ان سے مزاحمت کی۔

پولیس کے زندہ سپاہی کے ہاتھ کاٹ دیئے، پاؤں بھی کاٹ دیئے۔ اس کی زبان اور آنکھوں میں نوکدار کانٹے چبھو دیئے۔

اور خود رقصِ بسمل کا تماشا دیکھا کیا یہاں تک کہ وہ بے جان ہوکر از خود ساکت وصامت ہوگیا۔

ایسا مُجرم آپ کے سامنے پیش ہے اب اگر آپ ایسے جج ہیں۔

جس کے مدِّنظر جرائم کا فروغ نہیں بلکہ استیصال ہے۔

جس کے نزدیک ظالم کی جان مظلوم سے زیادہ قیمتی نہیں۔

جس کے نزدیک ظالم کا جسم مظلوم کے جسم سے زیادہ نازک نہیں۔

جس کے نزدیک ظالم کی چیخ و پکار مظلوم کے نالہ و بکا سے زیادہ جگر دوز نہیں۔

جس کے قلم میں ظالم کے آہنی پنجہ سے ظلم کی تلوار چھین لینے کی ہمت ہے۔

جس کے نزدیک حکومتِ وقت کا وقار کچھ معنی رکھتا ہے۔

تو آپ یقیناً

اس مجرم کے حق میں وہی فیصلہ دیں گے، جو اس رحمتِ عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے قوم عرینہ کے ان بدقماشوں کے حق میں صادر فرمایا تھا۔

لیکن اگر آپ ایسے جج نہیں بلکہ انصاف کی کرسی پر مجرموں کی وکالت کرنے والے

ججوں میں سے ہیں تو پھر اگر آپ کا فیصلہ اس فیصلہ کے خلاف ہے تو نہ ہمیں افسوس ہے اور نہ گلہ۔

آپ نے حدیثِ پاک پر تو جھٹ اعتراض فرمادیا لیکن آپ نے قرآن کریم کی اس آیتِ کریمہ کو ملاحظہ نہ فرمایا۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ
فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا وَتُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ
اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ خِزْیٌ فِی
الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ (المائدۃ ۳۲)

ترجمہ: ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے پھرتے ہیں یہ ہے کہ گن گن کر قتل کئے جائیں یا ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹے جائیں یا زمین سے دُور کر دیئے جائیں یہ دنیا میں اُن کی رسوائی ہے اور آخرت میں تو ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

جو قانون مجرموں پر رحم کرنا سکھلائے اس سے کبھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔ جو قانون ظالم کا دستِ ظلم کاٹنے کو بے رحمی کہے اس سے مظلوم کی فریاد رسی ناممکن ہے۔ وہ قانون جو قاتل کو تختۂ دار پر لٹکتا دیکھ کر آنکھیں میچ لے اُس سے انصاف کی توقع حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ قاتل کا سر بلا تامل قلم کردو۔ اس طرح تم ایک جان ضائع کرکے ہزاروں جانوں کی حفاظت کا سامان کرلوگے۔ فرمایا،

وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ ۱۷۹)

ترجمہ: اے عقلمندو! قصاص لینے میں ہی تمہاری بقا کا راز مضمر ہے۔

کیا ان تفصیلات پر نظر ڈالنے کے بعد آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ نہیں نکلتا کہ مذکورہ حدیث میں جو کچھ ذکر ہے وہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ حضور کریمؐ نے ضرور ایسا ہی کیا ہوگا۔ اور محدثین نے جو روایت کیا ہے وہ سو فی صدی درست ہے۔ الحمد للہ علی ذٰلک۔

دوسرا اعتراض آپ نے اس حدیث پر یہ کیا ہے کہ اونٹنیوں کا پیشاب پلید ہے اور حرام ہے۔ حضورؐ نے اہلِ عرینہ کو اس کے پینے کا کیسے حکم فرمایا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے۔ قرآن نے حالتِ اضطرار میں حرام کو مباح کیا ہے۔ مردار اور سُور حرام قطعی ہیں، لیکن اگر کوئی ایسی حالت آجائے تو پھر ان کا حسبِ ضرورت سدرمق کے لئے کھانا مباح ہے، ارشاد ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ
وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا
عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ: اس نے ہی تم پر حرام کئے ہیں مردار اور خون اور سُؤر کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں۔
بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اسی طرح اگر یقین ہو جائے کہ مریض بغیر اس حرام چیز کے استعمال کرنے سے بچ نہیں سکتا تو اُس کے لئے وہ چیز مُباح ہوگی، کیونکہ حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ وحی بتایا گیا تھا کہ ان کی شفا اس میں ہے۔ اس لئے ان کی اس اضطراری حالت میں انہیں اس کے پینے کی اجازت دی گئی۔

وصیت اور وراثت

ان کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیتِ وصیت میں وصیت کو فرض قرار دیا ہے اور اس میں وارث اور غیر وارث کا فرق نہیں کیا تو آپ کیوں کہتے ہیں کہ وصیت فقط ثلث مال (مال کے تیسرے حصّہ) میں جائز ہے اور وہ بھی غیر وارث کے لئے۔ وارث کے لئے وصیت سرے سے جائز ہی نہیں اور اس کی دلیل میں جو احادیث ہیں وہ چونکہ اُن کے نزدیک قرآن کے صریحاً خلاف ہیں اس لئے وہ غلط ہیں اور ان کو شکوہ ہے کہ صدیوں سے اُمت کا عمل سراسر قرآن کے خلاف رہا ہے اور کسی کو اس کی اصلاح کی جرأت نہیں ہوئی۔

حضراتِ منکرین! آپ کو اس چیز کا اعتراف ہے کہ صدیوں سے اُمت کا عمل یہی رہا ہے کہ وارث کے حق میں وصیّت کو ناجائز سمجھا گیا۔ اور غیر وارث کے لئے بھی مالِ متروکہ کے فقط تیسرے حصّہ میں وصیّت جائز رکھی گئی۔ لیکن آپ نے اس تاریخ کا تعین نہیں فرمایا جس وقت سے آپ کے گمان کے مطابق اُمت نے قرآن کی مخالفت شروع کی۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ آپ کو کوئی قرن ایسی نہیں مل سکی جس کے متعلق آپ یہ یقین سے کہہ سکیں کہ فلاں قرن میں اُمت کا عمل آپ کے خیال کے مطابق) اس نصِ قرآنی کے مطابق تھا۔ اور بعد ازاں اُمت نے وہ صراطِ مستقیم چھوڑ کر یہ غلط راستہ اختیار کیا کیونکہ اگر کتبِ حدیث اور تفسیر کو قانونی حیثیت نہ بھی دی جائے بلکہ فقط انہیں ملّتِ بیضا کی تاریخ تصوّر کر لیا جائے جس طرح آپ کا خیال ہے تو بھی ان کتب سے یہی پتہ چلتا ہے کہ حضورِ کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے عہدِ ہمایوں سے ہی مسلمانوں کا اسی طرح عمل رہا ہے، خلفائے راشدین نے بھی اس پر عمل کیا۔ ائمہ اربعہ اور فقہاء المحدثین بھی اس بات پر متفق رہے کہ وصیت وارث کے لئے جائز نہیں اور غیر وارث کے لئے بھی مالِ متروکہ کے تیسرے حصّے تک

وصیت کی اجازت ہے تو یہ سوچنے کا مقام ہے کہ کیا اس آیت وصیت کا معنی
اُمت کے کسی طبقہ کی سمجھ میں نہ آیا، یا کسی کو اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔
اور تو اور خلفائے راشدین نے بھی اپنے عہدِ معدلت پژدہ میں اس غلطی کا ازالہ نہ
کیا اور تو اور خود رحمتِ عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس آیت کا صحیح معنی صحابہ کو
کو نہ سمجھایا۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ آپ کو تبحرِ علمی اور قرآن فہمی پر اس قدر
غرور ہے کہ آپ ساری اُمت کے خلاف عدمِ فہم کا سنگین جرم عائد کر رہے ہیں۔ یہ
تو ناممکن ہے کہ ساری اُمت کا تعامل ہر زمانہ میں قرآن کے خلاف رہا ہو۔ یقیناً آپ کو
ہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے لئے آپ کے متعلق یہ رائے قائم کر لینا آسان ہے کہ آپ
سے چوک ہو گئی بہ نسبت اس کے کہ ہم ساری اُمت کو گم کردہ راہ یقین کریں۔

آپ کہیں گے کہ تو پھر اسلاف پرستی کے چکر میں پھنس گیا ہے، حالانکہ تحقیق
حق کرتے وقت تقلید کا حجاب اُٹھ جانا چاہئے۔ لیکن اگر اسلاف حق پر ہوں تب بھی
ان کا اتباع ناجائز ہے؟ کیا تحقیق کا یہ معنی ہے کہ ہر اس چیز کو ٹھکرا دیا جائے جسے
اسلاف سے نسبت ہو، خواہ اس کی حقانیت اور افادیت کی کرنیں اس بوڑھے آفتاب
و مہتاب سے بھی زیادہ تابناک اور حیات بخش ہوں؟

کیا قرآنِ کریم کی یہ آیات آپ کی نظر سے نہیں گزریں؟

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ
لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ
وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○

ترجمہ: بلکہ تم میں سے خود موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی، جب کہ اس نے اپنے
بیٹوں سے فرمایا میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے بولے ہم عبادت کریں گے اس

کی جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کا ایک خدا اور
ہم اس حضور گردن رکھے ہیں۔ یہاں بھی اولادِ یعقوب علیہم السلام اپنے اسلاف
کی تقلید کا وعدہ کرتے ہیں، اور حضرت یعقوبؑ ان کے اس وعدہ کو درست تسلیم
کرتے ہیں اور نہایت اطمینان سے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔
اس کے علاوہ زندانِ مصر میں یوسف صدیق علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

اور میں اپنے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے مذہب کا پیرو ہوں۔
تو پتہ چلا کہ اگر اسلاف حق پر ہوں تو ان کے نقشِ قدم پر چلنا برا نہیں بلکہ
یہ پیغمبروں کا شیوہ ہے۔

اب سنئے، پہلے میں غیر جانبدارانہ طور پر اہلِ سنت کا مسلک پیش کرتا ہوں
ور پھر اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فتویٰ آپ صادر فرمائیے۔ امید ہے کہ اگر آپ ان
دلائل و براہین پر غور فرمائیں گے تو حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔
اس پر تو آپ بھی متفق ہیں کہ نزولِ قرآن دفعۃً نہیں ہوا بلکہ تئیس سال کی مدت
میں نجماً نجماً اس کا نزول اجلال ہوا۔ اسی طرح احکام شریعت بھی ایک ساعت میں
اُمت پر فرض نہیں کئے گئے، بلکہ تدریجاً تدریجاً۔ اور دورِ جاہلیت کی طرزِ معاشرت کا
یکلخت قلع قمع نہیں کیا گیا، بلکہ آہستہ آہستہ اس کی اصلاح کی گئی۔ میت کے مالِ
متروکہ کی تقسیم کا رواج دورِ جاہلیت میں بھی تھا۔ لیکن اس کی تقسیم حقدار کے حق
کے مطابق نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ اس کا دارومدار مرنے والے کے لاابالی مزاج پر
تھا۔ اور وہ تمدن جس میں شراب خوری اور قمار بازی باعثِ فخر و مباہات تھیں اور
جن کے نزدیک معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عزت و شرف کا نشان سمجھا جاتا تھا
اسی طرح ان میں یہ قاعدہ بھی تھا کہ مرتے وقت اپنے مال کی وصیت ایسے لوگوں

کے نام کر جاتے جن کے ساتھ ان کا دور کا واسطہ بھی نہ ہوتا تھا۔ اور اسی کو وہ اپنے
زعم باطل میں سخاوت شمار کرتے تھے۔ اور اگر مرنے والا اپنے مالِ متروکہ کے متعلق
کوئی وصیت نہ کر جاتا تو پھر ان کے ہاں وراثت کا یہ قانون رائج تھا کہ مالِ متروکہ
اولاد اور بیوی میں تقسیم کر دیا جاتا اور والدین اور دوسرے قریبی رشتہ دار بالکل
محروم رہتے۔ یہ طریقہ چونکہ حق و انصاف کے بالکل خلاف تھا کہ مرنے والا بیگانوں کے لئے
اپنے تمام مال کی وصیت کر جائے اور اپنوں کو محروم کر دے یا اولاد اور بیوی تو وارث
ہوں اور بوڑھے ماں باپ کو کچھ بھی نہ ملے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ
کے مطابق نظامِ وراثت کو نازل فرمانے سے پیشتر وصیت کے متعلق آیات نازل
فرمائیں، یہ ان کے نظامِ معیشت کی اصلاح کی طرف پہلا قدم تھا۔ فرمایا:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ
الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِينَ ○ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى
الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ (بقرۃ)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کے متعلق ان کی مطلق العنانی کو روکا اور
قانونِ وراثت میں پہلی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:
"کہ جس وقت موت قریب آجائے تو تم پر فرض ہے کہ تم اپنے والدین اور
قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ وصیت کرو اور یہ متقین پر
فرض ہے، اور جس نے (حاضرین میں سے یا گواہوں میں سے) سننے کے بعد
وصیت میں تغیر و تبدل کیا تو اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہوگا۔ بیشک
اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"
حکم یہ دیا گیا تھا کہ وصیت کرتے وقت انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے

یعنی کسی کو اس کے حق سے کم یا زیادہ نہ دیا جائے لیکن تاہنوز کسی کا حصہ مقرر نہ تھا۔
اس لئے ایسی لغزش کے امکانات تھے۔ اس لئے ساتھ ہی اس نا انصافی کے
ازالہ کی صورت بھی بیان فرما دی۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ
فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ: پھر جسے اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے کچھ بے انصافی یا گناہ کیا تو اس نے
ان میں صلح کرا دی۔ اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں آپ غور کریں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ دورِ جاہلیت کے دستورِ
وراثت اور رواجِ وصیت میں گونہ آزادی دی گئی اور گونہ پابندی عائد کر دی گئی ان
کے اس رواج پر تو پابندی لگا دی جس کے مطابق وہ بیگانوں کو وصیت کر جاتے تھے
اور اپنوں کو محروم کر دیتے تھے لیکن ان کے قانونِ وراثت کو یکسر نہ بدلا بلکہ وصیت کے
ذریعہ سے والدین اور دیگر اقرباء کو حصہ دار بنایا۔ لیکن ان کے حصص مقرر نہ کئے بلکہ
اس میں موصی کو (وصیت کرنے والے کو) آزادی دی گئی کہ وہ خود از روئے انصاف
ان میں اپنا مالِ متروکہ تقسیم کر دے۔ اور جس وقت کسی نا انصافی کا اندیشہ ہو تو
دوسروں کو حکم دیا کہ وہ اس کی اصلاح کر دیں۔

دل کو عربی میں قلب کہتے ہیں کیونکہ یہ ہر دم تغیر پذیر رہتا ہے۔ دل محبت
و نفرت کے متضاد جذبات کا گہوارہ ہے۔ یہ چیزیں ہمارے ہر روز کے مشاہدہ میں
آتی رہتی ہیں کہ اولاد اپنے والدین سے متنفر ہو جاتی ہے اور والدین کبھی اپنے ایک
بچّہ کو دوسرے سے عزیز رکھتے ہیں۔ اور اکثر سوتیلی ماؤں کی موجودگی میں پہلی بیوی
کی اولاد باپ کے قہر و عتاب کا مورد بنی رہتی ہے، بسا اوقات ایک بھائی دوسرے
بھائی سے اتنا کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے کہ اس کی صورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جب

یہ چیزیں ہمارے روزمرہ کے تجربہ کی ہیں تو عین اغلب ہے کہ انسان کو اگر آزادی ہو تو وہ میزانِ عدل کا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اس لئے رب العزت نے اس کے بعد پورا نظامِ وراثت کے احکام نازل فرمائے تاکہ ان ہنگامی جذباتِ الفت و محبت سے انصاف کا خون نہ ہوتا رہے۔

احکام وراثت سورۂ نساء کے آغاز میں مفصل مذکور ہیں۔ حصے مقرر کرنے سے پہلے ایک قاعدۂ کلیہ بیان فرمایا اور اس کے بعد اس کی جزئیات کا تعین کیا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ
أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (النساء: ۷)

ترجمہ: مردوں کا حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑیں اسی طرح عورتوں کا حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑیں۔ خواہ مالِ متروکہ کم ہو یا زیادہ (آخر میں فرمایا کہ) ہر ایک کا حصہ مقرر شدہ ہے۔

یعنی پہلے تمھیں آزادی تھی کہ از روئے انصاف جو حصہ تم جس کا مقرر کردو وہی اُسے دیا جائے۔ لیکن اب تمام وارث مردوں اور وارث عورتوں کے حصے مشیتِ ایزدی کے مطابق مقرر کئے جاتے ہیں اور ان میں کمی بیشی کا تمھیں حق نہیں پہنچتا۔

زاں بعد حصے مقرر کرتے وقت یوں آغازِ کلام فرمایا۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ

(النساء: ۱۱)

ترجمہ: وصیت کرتا ہے تمھیں اللہ تعالیٰ تمھاری اولاد کے بارے میں۔ مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو۔

یعنی پہلے تم اپنی وصیت کے مطابق تقسیم کیا کرتے تھے، اب اللہ تعالیٰ کی

وصیت کے مطابق تقسیم کرو۔ وصیتِ خداوندی یقیناً مقدم ہوگی وصیتِ انسانی سے تو اس سے صاف طور پر واضح ہوگیا کہ پہلے والدین اور اقربا کے جو حصص آپ از روئے وصیت مقرر کرتے تھے اب ان کے قائم مقام انہیں وہ حصے دیئے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔

خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی تشریف آوری کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ احکام الٰہی کی تبلیغ اور ان کا اجراء کیا جائے اور جن کا منصب رفیع خود اللہ تعالیٰ نے بتایا۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

ترجمہ: اے محبوب! ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نازل فرمایا کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے واضح اور بے حجاب کرکے بیان فرمادیں۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں اپنے شہرۂ آفاق خطبہ میں اس کی وضاحت فرمائی۔ چنانچہ صحیح الترمذی میں ہے۔

عن عمرو ابن خارجة ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلم خطب
علی ناقته وانا تحت جرانها وهی تقصع بجرتها وان
لعابها یسیل بین کتفی فسمعته یقول:
ان اللہ اعطی کل ذی حق حقه ولا وصیة لوارث۔
قال الترمذی هٰذا حدیث حسن صحیح۔

ترجمہ: عمرو بن خارجہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ میں اس اونٹنی کی گردن کے اگلے حصہ کے نیچے کھڑا تھا اونٹنی جگالی کر رہی تھی۔ اس کا لعاب دہن میرے دونوں کندھوں کے درمیان بہ رہا تھا (یعنی میں بالکل قریب تھا، اس حالت میں) میں نے

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اس لئے اب وارث کے لئے وصیّت جائز نہیں۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

امام ابوبکر الجصاص اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو صحابہ کی کثیر تعداد نے نقل کیا ہے جس میں سے بعض کے نام سلسلۂ سند کے ساتھ انہوں نے لکھے ہیں اور وہ یہ ہیں:

عمرو بن خارجہ، ابوامامہ، ابن عباس، ابن عمر اور امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہٗ و رضی اللہ عنہم۔

متعدد اسناد لکھنے کے بعد وہ فرماتے ہیں۔

ھذا الخبر الماثور عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ورودہ من الجھات التی وصفنا ھو عندنا فی خبر التواتر لاستفاضته وشھرته فی الامة وتلقی الفقھاء ایاہ بالقبول واستعمالھم له[1]۔

یعنی یہ حدیث جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان متعدد جہتوں سے مروی ہے جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے ہمارے نزدیک یہ متواتر کے درجہ میں ہے کیونکہ اُمت (کے خاص و عام طبقہ) میں جو شہرت اسے حاصل ہوئی اور تمام علماء و فقہائے نے جس طرح اس کی صحت کو تسلیم کیا اور سب نے متفقہ طور پر اس پر عمل کیا یہ اس امر کی بین شہادت دیتے ہیں، کہ اس کا درجہ متواتر کا درجہ ہے۔

آیتِ وصیت، آیتِ میراث اور یہ حدیث آپ نے ملاحظہ فرمالیں۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ ان تینوں کا باہمی کیا تعلق ہے۔ کیا آیتِ وصیّت منسوخ ہے؟ یا مخصوص؟

۱؎ تفسیر احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۹۲

پھر اس کا ناسخ یا مخصص آیتِ میراث ہے یا یہ حدیث؟

مجھے معاف فرمائیے۔ اگر میں آپ کو بار بار ایسی بحثوں میں اُلجھنے پر مجبور کرتا ہوں جو بظاہر بہت خشک اور غیر دلچسپ معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ میری مجبوری کا بھی تو اندازہ فرمائیں، میں قصہ نویس یا افسانہ نگار تو نہیں کہ آپ کو تخیل کی گلپوش وادیوں کی سیر کراؤں یا رقصِ طاؤس و نغمۂ بلبل سے آپ کی نزہت و تفریح کا سامان کروں۔ میری تمنا تو یہ ہے کہ آپ کے دل میں علوم دین کے بحرِ ذخار کی گہرائیوں میں غواصی کا شوق پیدا ہو جائے جس کی کف بر دہان موجیں تن آسانوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتیں، لیکن اہلِ عزم و ہمت کی انتظار میں ماہیٔ بے آب کی طرح بیتاب ہیں۔

مذکورہ سوالات کے متعلق علماء اسلام نے اپنی گرانمایہ تالیفات میں نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ پیشِ خدمت کرتا ہوں۔

ان سوالات کا مختصر جواب تو یہ ہے۔

کہ آیتِ وصیّت منسوخ نہیں بلکہ پہلے عام تھی اس کے بعد اس کی تخصیص کی گئی۔

آیتِ وصیت کے عموم کی مخصص آیتِ میراث ہے اور حدیث پاک نے اس تخصیص کو واضح طور پر بیان کر دیا اور اس میں جو غموض اور اشکال تھا اسے رفع کر دیا۔

اور یہی نبی کا منصب ہے جس کے لئے علیم و حکیم رب اسے مبعوث فرماتا ہے۔

اب اس اجمالی جواب کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ آیتِ وصیت، آیتِ میراث سے پہلے نازل ہوئی اور اس سے مقصد ان کے اس ظالمانہ رواج کو ختم کرنا تھا جس سے وہ اپنی جھوٹی کبریائی کی تسکین کے لئے اپنوں کو محروم کر کے غیروں میں اپنی جائیداد تقسیم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے۔ یا ترکہ صرف اولاد کا حق تھا اور والدین کو کچھ حصہ نہیں ملتا تھا۔

یہ آیت جب نازل ہوئی تو عام تھی۔ عام کہتے ہیں اس لفظ کو جو اپنے مفہوم کے تمام افراد پر دلالت کرے۔ اس لئے والدین سے مراد تمام والدین تھے۔ خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، غلام ہوں یا آزاد۔ کسی قسم کی تخصیص نہیں تھی۔ اسی طرح اقربین سے بھی تمام اقرباء مراد تھے۔ خواہ ان سے دُور کا رشتہ ہو یا نزدیک کا ان میں بھی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔

بعد ازاں جب آیتِ میراث نازل ہوئی تو اس میں بعض اقرباء کا ورثہ میں حصہ مقرر کر دیا گیا اور بعض کا ذکر نہ کیا گیا اور وہ اقارب تھے۔ مثلاً اولاد کی موجودگی میں بھائی بہنیں وارث نہیں ہوتے حالانکہ وہ اقربین سے ہیں۔ تو اس آیت نے آیت وصیت کی تخصیص کر دی یعنی وہ اقربین جن کے لئے ورثہ مقرر کر دیا گیا۔ ان کے لئے وصیت کا حکم باقی نہ رہا اور باقی اقارب کے لئے وصیت کی اجازت کا حکم باقی رہا۔ اسی طرح جو والدین بعض عوارض کی وجہ سے میراث سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے بھی وصیّت کا حکم باقی رہا۔

اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وارث کو وصیت کرنے سے منع فرمایا تو اس کی وجہ بھی ساتھ ہی ذکر کر دی۔ ارشاد ہے:

ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔

یعنی چونکہ (نظامِ وراثت میں) اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے اس لئے اب وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ورثہ سے وہ اپنا پورا حق وصول کر چکا ہے۔ اب اگر وصیت سے بھی اُسے مزید حصہ ملے تو اس میں دوسرے مستحقین کی حق تلفی ہے اور یہ عین ظلم ہے جسے اسلام کا عادلانہ قانون برداشت نہیں کر سکتا۔

ممکن ہے حضرت معترض یہ کہیں کہ اگر وارثوں کے لئے وصیت جائز نہیں تو

آیاتِ میراث میں کیوں بار بار تاکیداً فرمایا گیا ہے۔

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ

یعنی وصیت نافذ کرنے کے بعد اور قرض ادا کرنے کے بعد ورثہ تقسیم کرو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وصیت سے وہ وصیت مُراد ہے جو غیر وارثوں کے لئے کی گئی یا جس کی اجازت آیتِ وصیت کی تخصیص کے بعد باقی ہے۔ اور وصیت کے بار بار تاکید کرنے کی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ وارث تو اپنے مسلمہ حق اور اپنے قوت کے بل بوتے پر وراثت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ ورثاء وصیت کو اپنی حق تلفی خیال کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کی طرف التفات نہ کریں اور اس طرح مرنے والے نے جس مقصد کے پیشِ نظر وصیت کی ہے وہ فوت ہو جائے۔ اس لئے ورثاء کو حکم دیا کہ پہلے وصیت اور قرض ادا کریں۔ اور اس کے بعد جو بچے اسے ان اصولوں کے مطابق بانٹ لیں، جو قرآن میں مذکور ہیں۔

عہدِ رسالت سے آج تک ان آیتوں کا یہی مفہوم سمجھا جاتا رہا۔ اور اسی پر عمل رہا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں بلکہ وہ اس حصہ کا مستحق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرما دیا۔

منکرینِ سنت ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں اور پھر اُمّت کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ۔

ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی جائداد کے متعلق وصیت کر جائے۔ اگر اس کی وصیت تمام جائداد کو محیط ہوئی تو ترکہ وصیت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا اور اس وصیت کے مقابلہ میں ان تمام احکام قرآنی کو پسِ پشت ڈال دیا جائے۔ جن میں ورثاء کے حصے مقرر کئے گئے ہیں اور اگر اس کی وصیت تمام جائداد کو محیط نہ ہوئی تو صرف باقی جائداد کو قرآن کے حکم کے مطابق وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور اگر مرنے والا

وصیت نہ کر پایا تو صرف اس صورت میں اسلامی نظام وراثت کے مطابق عمل ہوگا
آپ ہی کہیے کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو چاہے اپنے کسی ایک لڑکے یا اپنی چہیتی
بیوی یا لڑکیوں کو نظر انداز کر کے صرف لڑکوں کے نام اپنی تمام جائداد کی وصیت
کر دے اور باقی ورثاء کو محروم کر دے اور پھر اس ظلمِ شنیع کو شریعتِ اسلامیہ کی
طرف منسوب کرتے ہوئے یہ کہتا پھرے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے عین خدا کی کتاب
مقدس کے مطابق کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو صاف واضح طور پر فرما دیا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ
أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝

ترجمہ: مردوں کا حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقرباء چھوڑ جائیں اور عورتوں
کا حصہ ہے، اس مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑ جائیں۔ خواہ وہ مال کم ہو
یا زیادہ۔ (آخر میں فرمایا) ہر ایک کا حصہ مقرر شدہ ہے۔

اور یہ ہمارے نئے مفسر اور قرآن پر عمل کرنے کے مدعی فرماتے ہیں، نہیں مقرر
نہیں بلکہ ہم جیسے وصیت کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا
ہے کہ یہ قرآن پر عمل ہے یا ایک آیت کی آڑ لے کر باقی آیات کو معطل کرنا ہے؟

مگر تاویلش اندر حیرت انداخت خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

اصل بات یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک کے قوانین میں میراث کا
کوئی خاص نظام نہیں بلکہ ترکہ کی تقسیم کا انحصار صرف وصیت پر ہے تو ان فریب
خوردگان احساس کہتری کو یہ فکر دامنگیر ہو جاتا ہے کہ اگر اسلام ان قوانین سے ہم آہنگ
نہ ہو تو اسے غیر ترقی یافتہ سمجھا جائے گا۔ اس الزام سے بچنے کے لئے وہ اس کوشش

میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام میں بھی ترکہ کی تقسیم
کا دارومدار صرف وصیت پر ہے اور قانونِ وراثت تو صرف ایک استثنائی اور
اضطراری صورت کا وقتی حل ہے۔ جبکہ متوفی وصیت کئے بغیر مر جائے۔

لیکن ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلام کی عزت کسی قانون کی نقل میں نہیں
بلکہ اس کا دوام و خلود اور عظمت و شوکت ان عادلانہ احکام میں مضمر ہے جن کی افادیت
اور صلاحیت مرورِ زمانہ سے روشن تر ہو رہی ہے۔ ایسے جامع نظام
وراثت کا ہونا اسلام کا نقص نہیں بلکہ کمال ہے اور دوسرے قوانین میں ایسے نظام
کا نہ ہونا ان کے لئے سرمایۂ افتخار اور دلیل تقدم و ترقی نہیں، بلکہ گوناگوں اقتصادی
مشاکل کا باعث ہے۔

یہ حضرات اسلام کے حسین و جمیل خدوخال کو مسخ کر کے اسے اس وقت
(MODERNIZE) کرنے کے درپے ہیں جب کہ دوسری قومیں بیسیوں صدیاں
ٹھوکریں کھانے کے بعد اسلام سے قریب تر ہونے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

مسٹر جارج وائٹ کراس پیٹن (MR GEORGE WHITE CROSS PATON)
جو ملبورن یونیورسٹی میں فلسفہ قانون کے پروفیسر ہیں انہوں نے اپنی کتاب (A TEXT
BOOK OF JURISPRUDENCE) میں ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے جن سے
وصیت کرنے میں کھلی آزادی دینے سے معاشرہ کو دوچار ہونا پڑا اور ان کے انسداد
کے لئے جو مختلف تدابیر اختیار کی گئیں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ اس کتاب کا
ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

وصیت کرنے میں جو عام آزادی تھی اس کا یہاں تک ناجائز استعمال
کیا گیا کہ مریض بستر مرگ پر پڑے اپنی کسی دلی ترنگ کے زیر اثر اپنی تمام جائداد
کی وصیت اجنبیوں کے لئے کر دیتا اور اپنے بیوی بچوں کو فقر و فاقہ کی لعنت

میں جکڑ کر رکھ دیتا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں حکومت نیوزی لینڈ نے ایک بل پاس کیا جس کے ذریعے ایسی وصیت کرنے والے کے خاندان کے لئے جائداد کا کچھ حصہ مخصوص کر لینے کا انتظام ہو سکے۔ مملکتِ برطانیہ کے کئی حصوں میں بھی اس قسم کے قانون منظور کئے گئے، جن کی وجہ سے وصیت کنندہ کے خاندان کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے۔

خود انگلینڈ میں وصیت میں عام حریت کا قانون سنہ ۱۹۳۸ء میں تبدیل کر دیا گیا اور عدالت کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ وصیت کنندہ کی جائداد میں سے اس کی بیوی، کمسن بچے، غیر شادی شدہ لڑکی اور اس اولاد کے لئے جو جسمانی یا دماغی طور پر کسبِ معاش سے قاصر ہو، معقول اخراجات کا بندوبست کرے۔

ہم اس پر جتنا ناز کرتے بجا ہوتا کہ اسلام نے وراثت کی تقسیم کا جو عادلانہ نظام آج سے ساڑھے تیرہ صدیاں قبل انسانیت کو بخشا تھا۔ دیگر اقوام اتنی مدت گزرنے کے باوجود بھی ابھی اس سے دور ہیں اور اس مقام بلند تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں جہاں کملی والے عربی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہنمائی کے صدقے مسلمان زمانہ دراز سے پہنچ چکے ہیں۔ لیکن یہاں تو ناز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شریعت سے نفرت سی ہو گئی ہے اور دوسروں کو متنفر کرنے کا ایک جنون سوار ہے۔

اسلام نے وارث کے لئے وصیت کرنے سے روکا اور غیر وارث کے لئے یا کسی کارِ خیر میں شریک ہونے کے لئے وصیت کی اجازت دی لیکن اس میں حقِ وصیت کو بھی مطلق نہیں چھوڑا بلکہ اس کی حد بھی مقرر کر دی کہ وصیت جائداد کے تیسرے حصہ سے زائد نہ ہو۔ اس کے لئے جو حکمت نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والثناء نے بیان فرمائی وہ مندرجہ ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے اور اپنے پروردگار کے اس احسانِ عظیم کا

شکریہ ادا کیجئے کہ اس نے ہمیں ایسے رسولؐ کی اُمت کا شرف بخشا۔

عن سعد بن وقاص رضی الله عنه قال جاء النبی صلی الله علیه وسلم یعودنی وانا بمکة وهو یکره ان یموت بالارض التی هاجر منها قال یرحم الله ابن عفراء قلت یارسول الله اوصی بمال کله قال لا قلت الثلث قال فالثلث والثلث کثیر۔ انك ان تدع ورثتك اغنیاء خیر من ان تدعهم عالة یتکففون الناس فی ایدیهم وانك مهما انفقت من نفقةٍ فانها صدقة حتی اللقمة التی ترفعها الی فی امرأتك۔ وعسی الله ان یرفعك فینتفع بك ناس ویضر بك اٰخرون ولم یکن له یومئذٍ الا ابنة۔

ترجمہ: سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر میں مکہ مکرمہ میں سخت بیمار ہو گیا تو شفا بخش بیماران عصیاں صلی اللہ علیہ وسلم میری بیمار پُرسی کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ راوی کا خیال ہے کہ سعدؓ کو اس سرزمین میں مرنا جس سے وہ ایک دفعہ ہجرت کر کے چلے گئے پسند نہ تھا۔ حضورؐ نے آتے ہی اپنے لب جان نواز سے فرمایا، خدا ابن عفراء پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں تمام مال کی وصیت کرتا ہوں (یعنی میرے مرنے کے بعد تمام مال فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے) حضورؐ نے منظور نہ فرمایا پھر عرض کی نصف مال کی وصیت کرتا ہوں۔ یہ بھی نامنظور ہوئی۔ پھر عرض کی کہ تیسرے حصہ کی وصیت کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، ہاں ثلث درست ہے اور یہ بہت کافی ہے۔ (پھر فرمایا) اگر تو اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ جائے تو یہ اس سے

بدرجہا بہتر ہے کہ (تو اپنا سارا مال فقراء میں تقسیم کر دے اور) وہ محتاج ہوں اور
لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ اور جو کچھ تو کسی کے گزر اوقات
کے لئے خرچ کرے وہ بھی صدقہ ہے۔ حتّٰی کہ وہ لقمہ جو تو اپنی بیوی کے منہ میں اٹھا
کر رکھتا ہے۔ (یعنی اس پر بھی تجھے بارگاہِ الٰہی سے اجر و ثواب ملے گا) اور قریب ہے
کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بسترِ علالت سے اٹھائے گا اور تجھ سے کئی لوگ نفع حاصل کریں گے
اور کئی لوگوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس وقت ان کی صرف ایک بچی تھی۔

قربان جائیے۔ لسانِ نبوت کے اس اعجازِ تکلم پر! ایک مسئلہ کا شرعی فیصلہ
بھی صادر فرمایا اس کی علت بھی بیان فرما دی اور زاں بعد اپنے خدا داد علومِ غیبیہ
سے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ ابھی تمہاری موت کا وقت مقرر نہیں آیا اور کئی سال بعد
وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بھی پردہ اٹھا دیا کہ ابھی تو قدرت نے آپ سے
بہت کچھ کام لینا ہے۔

دنیا نے دیکھا کہ زبانِ رسالت ؐ سے نکلا ہوا ہر لفظ کس طرح پورا ہوا۔ وہ اس
بیماری سے شفایاب بھی ہوئے جس سے بچنے کی انہیں کوئی امید نہیں تھی۔ اور پھر
فاروقِ اعظم رضؓ کے عہدِ خلافت میں انہوں نے افواجِ اسلامیہ کی کمان سنبھالی۔
ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کو عزت و فتح دی اور ایرانیوں کو ذلیل
و خوار کیا۔

یہ حدیثِ پاک جو تقریباً صحاح کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، کیا ان لوگوں
کی کج فہمی دور کرنے کے لئے کافی نہیں جو علومِ نبوت کی حدود کا تعین کرتے وقت
اپنی قیاس آرائیوں سے کام لینے کے خوگر ہیں؟

آپ ایک بار پھر اس حدیث کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اور انصاف
سے کہئے کہ کیا معدلت گستری اور اقرباپروری کی اس سے بہتر تعلیم کا کہیں نشان ملتا ہے؟

کسی کے کہنے پر ہم بستانِ رسالت کے ایسے گلہاء رنگین کو زیب دستار
بنانے سے آخر کیوں محروم رہیں؟

قرعہ اندازی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج اقرع بین نسائہ۔

کہ حضور ؐ جس وقت سفر پر تشریف لے جاتے تھے تو اپنی ازواجِ مطہرات
میں قرعہ اندازی فرماتے جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے معیت وہمرکابی کا شرف
نصیب ہوتا۔

اس حدیث پر حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کا نام لے کر اعتراض کیا گیا ہے کہ
امام صاحب نے یہ کہہ کر اس حدیث سے انکار کر دیا کہ قرعہ اندازی اصولاً قماربازی
ہے۔ جو حرام ہے اس لئے اس حدیث کو کیسے صحیح مانا جا سکتا ہے۔

معلوم نہیں انہوں نے امام صاحب رحؒ کے یہ الفاظ کہاں سے نقل کئے ہیں معتبر
اور مشہور کتب میں تو امام صاحب کا یہ قول منقول ہے:

حکی ابن المنذر عن ابی حنیفۃ انہ جوزھا وقال
ھی فی القیاس لا تستقیم ولکنا نترك القیاس فی
ذلك للاٰثار والسنۃ۔[1]

ترجمہ: ابنِ منذر نے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ آپ قرعہ اندازی کو جائز سمجھتے
تھے۔ اور کہتے تھے کہ قیاساً تو قرعہ اندازی درست معلوم نہیں ہوتی لیکن ہم
قیاس کو آثار اور سنتِ نبوی کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔

اس کی مزید توضیح کے لئے ذرا مندرجہ ذیل اقتباس پڑھئے۔

[1] عمدۃ القاری۔ باب ھل یقرع فی المقسمۃ۔

وفيه صحة القرعة بين النساء وبه استدلال مالك
والشافعي واحمد وجماهير العلماء في العمل بالقرعة في القسم
بين الزوجات وفي العتق والوصايا والقسم ونحو ذلك (قيل)
المشهور عن ابي حنيفة ابطال القرعة قلت (العيني) ليس
المشهور عن ابي حنيفة ابطال القرعة وابو حنيفة لم يقل
كذلك وانما قال القياس يأباها لانه تعليق لا استحقاق
بخروج القرعة وذلك قمار ولكن تركنا القياس للآثار و
للتعامل الظاهر من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم
الى يومنا هذا من غير نكير منكر وانما قال ههنا يفعل
تطييبا لقلوبهن - (عمدة القاري - حديث الافك)

حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ عینی لکھتے ہیں :

کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورتوں کے درمیان قرعہ اندازی کرنا صحیح ہے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور جمہور علماء نے مختلف اُمور میں قرعہ اندازی کے جواز کے لئے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مشہور یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اس کو باطل سمجھتے ہیں۔ علامہ عینی کہتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے، امام صاحب سے ہرگز یہ مشہور نہیں امام صاحب نے ہرگز ایسا نہیں کہا۔ بلکہ آپ نے تو یہ کہا ہے کہ قیاس اس سے انکار کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں استحقاق ملحوظ نہیں بلکہ اس میں کام کو قرعہ نکلنے سے معلّق کیا جاتا ہے۔ اور یہ جُوا ہے، لیکن آثار (یعنی اقوال صحابہ و تابعین) اور عہد رسالت سے آج تک اُمت کے اس پر عمل پیرا رہنے کے لئے، ہم اپنے اس قیاس کو ترک کرتے ہیں۔ حضورؐ کا یہ فعل (یعنی قرعہ اندازی) ازواج مطہرات

کی پاس خاطر کے لئے ہوا کرتا تھا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے قطعاً اس حدیث کو ترک نہیں فرمایا بلکہ اپنے قیاس کو جھٹک دیا۔ کیونکہ وہ سنتِ نبوی سے ہم آہنگ نہ تھا۔ امام صاحب نے تو اس الجھن کو بالکل صاف کر کے رکھ دیا کہ اگر کہیں قیاس اور سنت میں تقابل ہو جائے اور تمہیں اپنے قیاس کی درستی کا کتنا پختہ یقین کیوں نہ ہو، اس وقت بھی اپنے قیاس کو چھوڑ دو اور سنتِ مصطفوی پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اسی میں تمہاری فلاح دارین ہے اور یہی حقیقتِ حقہ ہے۔

اس موقعہ پر میں ایک الزام کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

عام طور پر منکرینِ سنت کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جب کسی حدیث کو اپنے قیاس کے مطابق نہیں پاتے تھے تو حدیث کو ترک کر دیا کرتے تھے اور اپنے قیاس پر عمل کرتے اور اسی چیز کو وہ اپنے لئے ترکِ سنّت کی سند قرار دیتے تھے۔

کیا واقعی امام صاحب اپنے قیاس کے مقابلہ میں اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کو ترک کر دیتے تھے؟ یا یہ الزام ہے اور بالکل بے بنیاد اور جھوٹا الزام؟

جس شخص کی فقہ حنفی پر وسیع نظر ہے اس سے تو یہ امر مخفی نہیں کہ ہزاروں مسائل ایسے ہیں جہاں امام صاحب نے اپنے قیاس کو ترک کر کے حدیث پر عمل کیا خواہ وہ حدیث خبر واحد ہو۔ ان کھُلے شواہد کے باوجود یہ کہنا کہ امام صاحب حدیث پر قیاس کو ترجیح دیتے تھے، بالکل بے بنیاد اتہام ہے۔

اب امام صاحب کے اپنے چند اقوال کا مطالعہ فرمائیے، تاکہ پھر کسی مزید شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ آپ اپنے طریقۂ اجتہاد کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

انا ناخذ اولاً بكتاب الله ثم بالسنة ثم باقضية الصحابة

ونعمل بما یتفقون علیہ فان اختلفوا قسنا حکما علی حکم

بجامع العلة بین المسئلتین حتی یتضح المعنیٰ۔[1]

ترجمہ: ہم سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے بعد سنّتِ رسول اللہ پر اس کے بعد صحابہ کرام کے فیصلوں پر نظر کرتے ہیں جن مسائل میں وہ متفق ہوں۔ ان پر عمل کرتے ہیں اور جن میں ان کا (نصِ قرآن یا حدیث نہ ہونے کے باعث) اختلاف ہو، وہاں ہم علت حکم کے وجود سے ایک حکم کو دوسرے حکم پر قیاس کرتے ہیں، یہاں تک کہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

ایک دوسرا قول جو آپ سے مروی ہے۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ وہ قیاس پر صرف اس وقت عمل کرتے ہیں، جب قرآن و سنّت سے اس کا حکم معلوم نہ ہو سکے فرماتے ہیں:

نحن لا نقیس الا عند الضرورة الشدیدة وذلک اننا ننظر

فی دلیل المسئلة من الکتاب والسنة او اقضیة الصحابة

فان لم نجد دلیلا قسنا حینئذ مسکوتا عنہ علیٰ منطوق بہ۔[2]

ترجمہ: ہم انتہائی مجبوری کے بغیر اجتہاد نہیں کرتے۔ کسی مسئلہ کی دلیل کے لئے پہلے ہم قرآن و سنت اور صحابہ کے فیصلوں میں غور کرتے ہیں اور اگر کہیں دلیل نہ ملے اس وقت ہم مسئلہ کو جس کا حکم کتاب و سنّت میں مذکور نہیں۔ اس مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں جس کا حکم مذکور ہے۔

ایسی کھلی اور واضح تصریحات کے بعد بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سنتِ نبوی کی موجودگی میں اپنے قیاس پر عمل کرتے تھے۔ آپ کا یہ ارشاد

[1] المیزان للشعرانی ج ۱ ص ۵۱۔ [2] المیزان للشعرانی۔

سنئے، یقیناً تقویتِ ایمان کا باعث ہو گا۔

وکان یقول ما جاء عن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

فعلی الرأس والعین بابی وامی ولیس لنا مخالفتہ۔

ترجمہ: آپ کہا کرتے تھے کہ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں پہنچے وہ ہمارے سر اور آنکھوں پر ہے میرے ماں باپ حضورؐ پر قربان ہوں اور ہماری یہ مجال نہیں کہ ہم حضورؐ کے کسی فرمان کی مخالفت کریں۔

یہ ہیں وہ بعض اقوال جو میں نے آپ کے متعدد اقوال سے منتخب کر کے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں، اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ منکرینِ سنّت کا دعویٰ کہ امام صاحب اپنے قیاس کو سنتِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر ترجیح دیتے تھے، کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے؟

رحمتِ عالم، ہادیٔ اعظم، نورِ مجسّم سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی احادیثِ طیبہ اور ارشاداتِ نیرہ پر ان کے چند زوردار اعتراضات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں۔ دیگر اعتراضات کی بے سروپائی اور تہی دامنی کو آپ ان پر قیاس کر سکتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوئی تو کسی دوسری صحبت میں باقی شکوک و شبہات کے متعلق بھی بحث کروں گا۔

جس رحمٰن اور رحیم رب کا نام لے کر اس کتاب کا آغاز کیا تھا، اسی رحمٰن اور رحیم رب کا نام پاک لے کر اس کا اختتام کرتا ہوں۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ رَبِّ

ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ واید بنصرتک فخر العلماء العاملین

وقدوة الفضلاء الاتقياء المجاهدين

مولٰنا محمد قمرالدين

صاحب السجادة الشريفة بسيال شريف

واجعله رب قمرا منيرا۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝

بجاه حبيبك المصطفى ورسولك المرتضى رحمة للعلمين وشفيع المذنبين وخاتم الانبياء والمرسلين سيدنا وسيد الخلق محمد الامين الرؤف الرحيم و

صلى عليك الله يا علم الهدٰى ماحن مشتاق الى مثواك

وعلى صحابتك الكرام جميعهم والتابعين وكل من اهواك

وفرغت بتوفيقه تعالى من تسويد هذه الصفحات فى الساعة المبكرة من يوم الجمعة المباركة الثانى والعشرين من صفرسنة ۱۳۷۳ هجرية. وانا طالب بقسم التخصص بكلية الشريعة الاسلامية بالازهر الشريف القاهرة۔

عبده المذنب

ابوالحسنات محمد كرم شاه

كتبه عبدالروٴف بن مشتاق احمد